مردودانِ حرم کا خدا

مصنف: اردون دھتی رائے

مترجم: محمد عامر حسینی

The God of Small Things

Arundhati Roy

فہرست ابواب

- محبت کے قوانین (Welcome Home, Our Sophie Mol)
- لبریز سچائیاں (Mrs. Pillai, Mrs. Eapen, Mrs. Rajagopalan)
- چھوٹے خدا بول اُٹھے (The River in the Boat)
- بند سیڑھیاں (The God of Small Things)
- پھیکی یادوں کا شور (Kochu Thomban)
- ٹوٹتے وعدے (The Pessimist and the Optimist)
- خاموش معافی کا لمحہ (Work is Struggle)
- ملبے میں چھپی زندگی (The History House)
- محبت کی ممنوع دنیا (A Few Hours Later)
- خوابوں کا اختتام (Coeval)

I
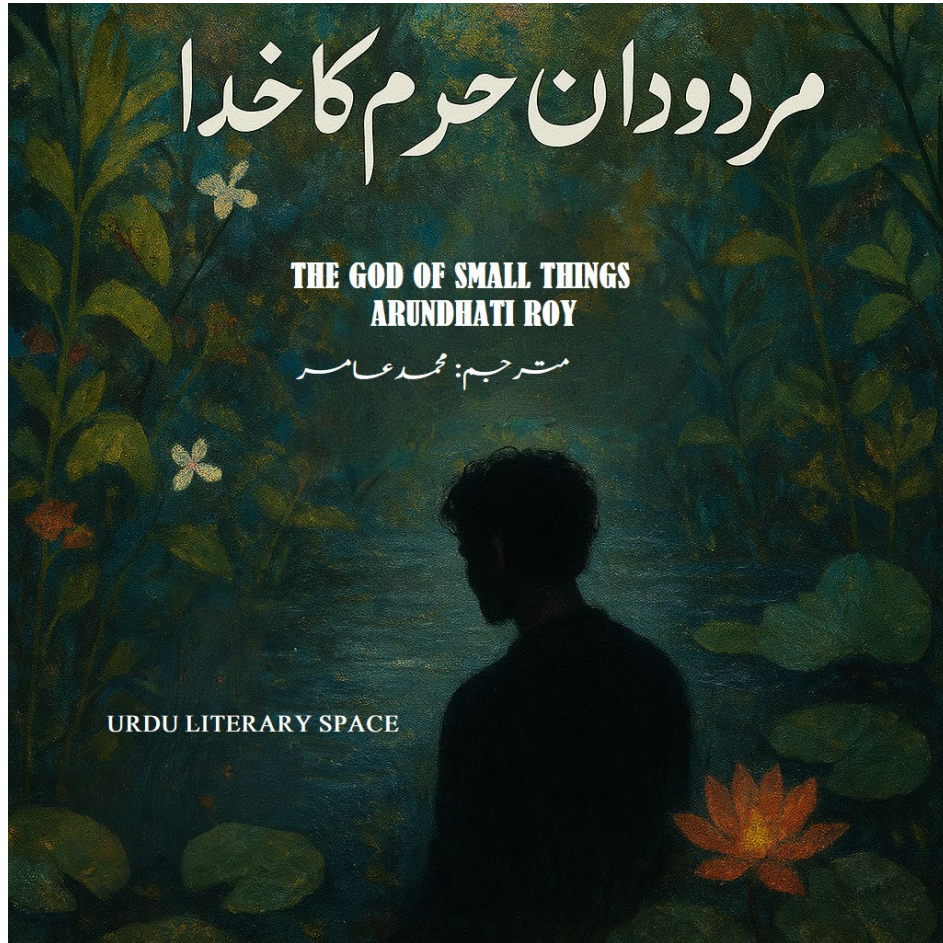
چار، جنت، اور بند بوتلیں

(Paradise Pickles & Preserves)

ایمنم میں مئی کا مہینہ ایک گہری، گھمبیر خاموشی میں لپٹا ہوا، پسینے سے تر بتر، **بے زار سا موسم** ہوتا ہے۔ دن لمبے ہوتے ہیں، بوجھل اور نمی سے لبریز، جیسے ہوا میں سانس گھٹنے لگے۔ دریا سکڑ جاتا ہے، دھوپ میں ستائے ہوئے درختوں پر کالے کوّے شوخ آموں پر یوں جھپٹتے ہیں جیسے پرانی، بھوکی یادیں۔ سرخ کیلے پکنے لگتے ہیں، اور کٹھل پھٹ کر اپنی مہک بکھیر دیتے ہیں۔ جنگلی نیلی مکھیوں کی جُھنکار، **میٹھے** پھلوں کی باس میں بکھری ہوتی ہے، مگر وہ یوں لگتا ہے جیسے کسی خالی ذہن نے سانس لی ہو۔ پھر وہ ان شفاف کھڑکیوں سے جا ٹکراتی ہیں، جنہیں سمجھنے کی سکت نہیں، اور دھوپ میں **موٹی، حیران، اور مردہ** پڑ جاتی ہیں۔

راتیں صاف ہوتی ہیں، مگر اُن میں ایک **کاہلی بھرا انتظار** تحلیل ہوتا ہے—ایک گھمبیر، دبیز خاموشی جیسا، جیسے بارش کی چاپ ابھی سنائی دینے ہی والی ہو۔ جون کے آغاز میں، جنوب مغربی مانسون اچانک اُمنڈ آتا ہے، اور پھر تین ماہ کی بارش، ہوا،

اور سیلاب کا موسم چھا جاتا ہے۔ درمیان میں کچھ لمحے ایسے آتے ہیں—چھوٹے، چمکدار، چوری کیے ہوئے سورج کے لمحے—جنہیں بچے پکڑ لیتے ہیں، کھیلنے کے لیے، جیسے دھوپ کو چھو لیا ہو۔ دیہی زمینیں بے شرم سبز ہو جاتی ہیں۔ حدیں مٹنے لگتی ہیں، جب تیپو کا کی باڑھیں جڑیں پکڑ لیتی ہیں اور پھولنے لگتی ہیں۔ اینٹوں کی دیواریں کائی سے ڈھک جاتی ہیں، مرچ کی بیلیں بجلی کے کھمبوں کو چومنے لگتی ہیں، اور جنگلی بیلیں مٹی کی ڈھلانوں سے پھوٹ کر بارش میں ڈوبی سڑکوں پر بکھر جاتی ہیں۔ بازاروں میں کشتیاں تیرتی ہیں۔ اور جہاں پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ نے سڑکوں پر گڑھے چھوڑے ہوتے ہیں، وہاں بارش کے پانی میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں تیرنے لگتی ہیں۔

بارش ہو رہی تھی جب راحیل لوٹی۔ برسوں بعد، دھندلائے ہوئے وقت کی پرتوں کو چیرتی ہوئی ایمنم واپس آئی—اور آسمان سے گرتی ہوئی بارش کسی پرانی جنگ کی یاد کی طرح زمین پر برس رہی تھی۔ چاندی جیسے ترچھے دھاگے نرم مٹی پر یوں برس رہے تھے جیسے خاموش فائرنگ ہو رہی ہو۔ پہاڑی پر واقع وہ پرانا گھر—وہ جو کبھی کسی کہانی کے دروازے پر ٹھہرا رہتا تھا—اب بھی اپنی گہری چھت کو کانوں تک کھینچے بیٹھا تھا، جیسے سر پر ٹوپی ہو جو آنکھوں تک جھک گئی ہو۔ دیواریں، جن پر

کائی کی سبز لکیریں تھیں، وقت اور نمی سے نرم پڑ چکی تھیں، اور زمین کی اندرونی سیلن نے انہیں اندر سے پھُلا دیا تھا۔ باغ وحشی ہو چکا تھا —ایک ادھ جمی ہوئی زندگی کا ٹھکانہ —جہاں جھاڑیوں کے نیچے چھوٹے جاندار سرگوشیوں میں باتیں کرتے، اور پتوں کی اوٹ سے زندگی سانس لیتی محسوس ہوتی تھی۔ ایک چوہے سانپ نے، گیلی مٹی میں چمکتے پتھر سے اپنی جلد کو رگڑ کر جیسے برسوں کی نیند سے خود کو جگایا ہو۔ ایک بھیگا ہوا نیولا بجلی کی طرح پتوں سے اٹی پگڈنڈی کو پار کر گیا۔ جوہڑ میں بدبودار پانی کے کنارے پیلے مینڈک، نرم تیزاب میں تیرتے کسی خواب کی طرح، کسی ساتھی کے متلاشی تھے۔

گھر سنسان تھا۔ دروازے بند تھے، کھڑکیاں خاموش، برآمدہ خالی اور اجاڑ، جیسے کسی نے وہاں وقت کا بٹن بند کر دیا ہو۔ مگر وہی آسمانی نیلی پلیماؤتھ کار، جس کے پچھلے حصے پر کروم کی دمیں چمکتی تھیں، اب بھی گیٹ کے پاس کھڑی تھی۔ اور گھر کے اندر، بے بی کوچمّا اب بھی زندہ تھی۔

وہ راحیل کی نانی کی چھوٹی بہن تھی—نانا کی سب سے چھوٹی۔ اصل نام نوومی ایپ تھا، مگر سب اسے بے بی کہتے تھے۔ جب وہ اتنی بڑی ہوئی کہ

خالہ کہلائی جاسکے، تو "بے بی کوچمّا" بن گئی۔ لیکن راہیل اسے دیکھنے نہیں آئی تھی — نہ اُس کے دل میں یہ گمان تھا، نہ بے بی کوچمّا کے۔ راہیل آئی تھی اپنے بھائی، استھا کو دیکھنے — اپنے جڑواں کو۔ وہ دونوں ایک ساتھ پیدا ہوئے تھے، مگر ایک جیسے نہیں۔ دو انڈوں والے جڑواں۔ ڈاکٹروں کی زبان میں "ڈائیزائیگوٹک"۔ دو الگ مگر ایک ساتھ بارآور ہونے والے انڈوں سے جنم لینے والے۔ استھا پن — جسے سب استھا کہتے تھے — اٹھارہ منٹ بڑا تھا۔

وہ کبھی بھی ایک جیسے نہیں لگے — نہ بچپن میں جب وہ پتلے بازوؤں، پچکے سینوں اور کیڑوں سے پریشان وجودوں کے ساتھ، ایلوِس پریسلے جیسے پھولے چہروں کے ساتھ پھرتے تھے۔ تب بھی کسی نے اُن کی پہچان میں دھوکہ نہیں کھایا۔ نہ رشتے داروں نے، نہ وہ شامِی آرتھوڈوکس بشپ جو اکثر ایمنم ہاؤس میں چندے کے لیے آجایا کرتے تھے۔

مگر پہچان کی الجھن کہیں اور تھی — ایک پوشیدہ، خاموش جگہ میں۔

ان دنوں —ان ابتدائی، غیر شکل یافتہ برسوں میں —جب یادداشت نے ابھی زبان نہیں سیکھی تھی، جب ہر دن ایک آغاز تھا، اور انجام جیسی کوئی شے وجود ہی نہیں رکھتی تھی، جب ہر چیز ہمیشہ کے لیے ہوتی تھی —ان دنوں راہیل اور استھا، اپنے آپ کو "میں" کہہ کر جانتے تھے، اور ایک دوسرے کو "ہم"۔ جیسے وہ کوئی نایاب سیامی جڑواں ہوں —جسم سے جدا، مگر وجود میں پیوست۔

اب، اتنے برسوں بعد، راہیل کو یاد ہے کہ وہ ایک رات، استھا کے خواب پر بے اختیار ہنستے ہوئے جاگ اٹھی تھی۔ اسے وہ باتیں بھی یاد ہیں جو اس نے دیکھی ہی نہیں تھیں۔ جیسے ابھلاش ٹاکیز میں، اورنج ڈرنک لیمون ڈرنک والے شخص نے استھا کے ساتھ جو کچھ کیا تھا —وہ لمحہ، وہ خاموش، منحوس لمس۔ یا مدراس میل میں کھائی گئی ٹماٹر کی سینڈوچز —وہ سینڈوچز جو استھا نے کھائی تھیں، مگر ذائقہ جیسے راہیل کے ہونٹوں پر رہ گیا ہو۔

اور یہ تو صرف چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں۔

اب وہ اُن دونوں کو—راہیل اور استھا کو—"وہ" کہہ کر سوچتی ہے، کیونکہ اب وہ "ایک" نہیں رہے، نہ اپنے خیال میں، نہ ایک دوسرے کے آئینے میں۔

کبھی نہیں۔

اب ان کی زندگیاں ایک مخصوص حجم رکھتی ہیں، ایک صورت، ایک خدوخال۔ اب ان کے درمیان سرحدیں ہیں، کنارے ہیں، فاصلے ہیں—جیسے وقت کے افق پر چھوٹے چھوٹے بونے چھاؤں لیے پہرہ دے رہے ہوں۔ ان کی آنکھوں کے نیچے آدھے چاند جمع ہو گئے ہیں، اور وہ اتنے بڑے ہو چکے ہیں جتنی عمر میں اُن کی ماں امّو مری تھی—اکتیس برس۔

نہ جوان۔

نہ بوڑھے۔

بس ایک ایسی عمر—جو مرنے کے لیے کافی ہے۔

استھا اور راہیل تقریباً ایک بس میں پیدا ہونے والے تھے۔ اُن دنوں ان کے والد—جنہیں وہ بابا کہتے تھے—ان کی ماں امّو کو اسپتال لے جا رہے تھے، شیلانگ میں، جہاں اُن کی ولادت ہونی تھی۔ مگر

چپائے کے باغات سے گزرتی بل کھاتی سڑک پر کار خراب ہو گئی۔ انہیں کار وہیں چھوڑنی پڑی اور راستے سے گزرتی ریاستی ٹرانسپورٹ کی ایک پرانی، بھری ہوئی بس کو ہاتھ دے کر روکا۔ اور پھر — جیسے غریبوں میں ایک عجیب سی ہمدردی ہوتی ہے ان لوگوں کے لیے جو اُن سے تھوڑے بہتر حال میں ہوں — یا شاید صرف اس لیے کہ وہ امّو کے پیٹ کی ابھری ہوئی، بے چین گولائی کو دیکھ سکتے تھے — بیٹھے ہوئے مسافروں نے جگہ بنا دی۔ اگلے راستے بھر استھا اور راہیل کے والد کو اپنی بیوی کے پیٹ کو — جس میں وہ دونوں پل رہے تھے — دونوں ہاتھوں سے تھامے رکھنا پڑا، تاکہ وہ زیادہ ہلے نہ۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب طلاق نہیں ہوئی تھی۔ جب امّو اب بھی اُن کے ساتھ تھی۔ جب وہ اب بھی "فیملی" کہلاتے تھے۔ پھر، کچھ برس بعد، امّو بچوں کو لے کر کیرالہ واپس چلی آئی۔

استھا کے مطابق اگر وہ واقعی بس میں پیدا ہو جاتے، تو حکومت انہیں تمام عمر مفت بس سفر کی اجازت دے دیتی۔ یہ معلومات اسے کہاں سے ملی تھیں، کوئی نہیں جانتا تھا۔ مگر برسوں تک، دونوں جڑواں بچوں نے اپنے والدین سے ایک خفیف سی

ناراضی پالے رکھی — جیسے ان کے والدین نے انہیں ایک عمر بھر کے مفت سفر سے محروم کر دیا ہو۔

انہیں یہ بھی یقین تھا کہ اگر کوئی زیبرا کراسنگ پر مر جائے، تو حکومت اُس کے جنازے کا خرچ اٹھاتی ہے۔ ان کے ذہن میں یہ تصور پختہ تھا کہ زیبرا کراسنگ کا مقصد یہی ہے — مفت جنازہ۔

اگرچہ ایمنم میں کوئی زیبرا کراسنگ نہ تھی — حتیٰ کہ قریبی شہر کوٹائم میں بھی نہیں — مگر انھوں نے کوچین جاتے ہوئے کار کی کھڑکی سے زیبرا کراسنگ ضرور دیکھی تھی، جو یہاں سے دو گھنٹے کی مسافت پر تھا۔

حکومت نے صوفی مول کے جنازے کے لیے کچھ نہیں دیا، کیونکہ وہ زیبرا کراسنگ پر نہیں مری تھی۔

صوفی مول — استھا اور راہیل کی کزن، ان کے ماموں چاکو کی بیٹی — انگلینڈ سے آئی ہوئی تھی۔ جب وہ مری، تب استھا اور راہیل سات برس کے تھے۔ صوفی مول کی عمر تقریباً نو برس تھی۔ اُس کے لیے

ایک خاص چھوٹا سا تابوت بنایا گیا—اندر سے ریشمی استر لگا ہوا، پیتل کے چمکدار دستے۔

وہ اس میں لیٹی تھی—اپنے پیلے کرمپلین کے بیل باٹمز پہنے، بالوں میں ربن بندھا ہوا، ہاتھ میں وہ "میڈ ان انگلینڈ" چھوٹا سا گو-گو بیگ تھامے جسے وہ بے حد پسند کرتی تھی۔ اس کا چہرہ پیلا تھا—اور اتنا جھریوں بھرا، جیسے کسی دھوبی کے انگوٹھے کی جلد جو پانی میں زیادہ دیر بھیگنے سے سکڑ گئی ہو۔

گرجا گھر، جس کی دیواریں پیلی تھیں اور تازہ رنگ کی باس سے مہک رہی تھیں، سوگواروں سے بھر گیا۔ ہر سانس میں، ہر آواز میں اداسی تھی۔ پادری، جو گھنگھریالے بالوں اور نرمی سے لبریز آنکھوں والے تھے، لوبان کے دھوئیں سے بھرے برتنوں کو زنجیروں سے جھلاتے تھے۔ مگر اس دن، وہ بچوں کی طرف مسکرا کر نہیں دیکھتے تھے—جیسا وہ عام اتواروں کو کرتے تھے۔

قربان گاہ پر لمبی موم بتیاں جھکی ہوئی تھیں۔ چھوٹی ابھی بھی سیدھی کھڑی تھیں۔

ایک ضعیف عورت، جو خود کو کوئی دور کی رشتہ دار بتاتی تھی (حالانکہ

کوئی اُسے پہچانتا نہ تھا، اور جو اکثر جنازوں میں اچانک نمودار ہو جایا کرتی تھی— کوئی جنازہ پرست؟ یا شاید ایک دبی دبی جسمانی کشش کی اسیر؟)، اس نے خوشبودار کولون ایک روئی کے گالے پر لگائی، اور نرمی اور دیوانگی سے لبریز ارادت کے ساتھ صوفی مول کی پیشانی پر لگا دی۔

اب صوفی مول کی خوشبو کولون اور تابوت کی لکڑی سے بنی تھی۔

مارگریٹ کوچمّا— صوفی مول کی انگریز ماں — نے چاکو کو اجازت نہ دی کہ وہ اُسے تسلی دینے کے لیے بازو میں لے۔

پورا خاندان قریب قریب کھڑا تھا — مارگریٹ کوچمّا، چاکو، بے بی کوچمّا، اور اُن کے برابر میں اُن کی بھابھی، ماماچی — استھا اور راہیل (اور صوفی مول) کی نانی۔ ماماچی تقریباً نابینا تھیں اور ہمیشہ سیاہ چشمہ پہنتی تھیں جب گھر سے باہر نکلتی تھیں۔ اُن کی آنکھوں سے بہتے آنسو چشمے کے پیچھے سے نکلتے، اور اُن کے چہرے کی ہڈیوں پر اس طرح لرزتے جیسے بارش چھت کے کنارے پر ٹھہر جائے۔ وہ اپنی کلف لگی سفید ساڑھی میں چھوٹی اور بیمار سی لگ رہی تھیں۔

چاکو اُن کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اپنی ذاتی اذیت کے ساتھ ساتھ، وہ اُس کے دکھ میں بھی تڑپتی تھیں۔

اگرچہ امّو، استھا اور راہیل کو جنازے میں شامل ہونے دیا گیا، مگر انہیں باقی خاندان سے دور کھڑا رکھا گیا۔
کسی نے ان کی طرف نہیں دیکھا۔
گرجا گھر کے اندر حبس تھا، اور ارُم للیز کے سفید کنارے سوکھ کر مرجھانے لگے تھے۔ ایک مکھی، کسی پھول کے اندر مر گئی۔
امّو کے ہاتھ کانپ رہے تھے، اور ان کے ساتھ اُن کا حمدیہ کتابچہ بھی۔ ان کی جلد ٹھنڈی تھی۔ استھا اُن کے قریب کھڑا تھا، شاید مکمل طور پر جاگتا بھی نہ تھا — اُس کی آنکھوں میں شیشہ جیسی چمک تھی، اور اُس کے جلتے ہوئے گال امّو کے ننگے بازو سے لگے ہوئے تھے — اسی بازو سے جس میں وہ حمدیہ کتاب تھامے کھڑی تھیں۔
راہیل، اس کے برعکس، پوری طرح بیدار تھی — ایک ایسے چوکس سپاہی کی طرح جو مسلسل "اصل زندگی" کے خلاف جنگ لڑتے لڑتے تھک چکا ہو، مگر ابھی ہارا نہ ہو۔
اُس نے دیکھا کہ صوفی مول اپنی آخری رسومات کے دوران جاگ رہی تھی۔ اُس نے راہیل کو دو چیزیں دکھائیں۔ پہلی چیز یہ تھی: گرجا کے اونچے گنبد کی اندرونی چھت، جو راہیل نے اس سے پہلے

کبھی نہیں دیکھی تھی ـــ نیلے آسمان کی مانند رنگی ہوئی، جس میں بادل تیر رہے تھے اور اُن میں سے سفید دھاریاں کھینچتے ہوائی جہاز گزر رہے تھے۔

یہ سچ ہے (اور کہنا ضروری ہے) کہ یہ منظر دیکھنا تابوت میں لیٹے ہوئے کہیں زیادہ آسان تھا، بہ نسبت ان لمبے سانسوں اور مرثیے کی زد میں آئے لوگوں کے درمیان کھڑے ہو کر، جن کے کولہوں سے بدن چپکا ہوا تھا اور جن کے ہاتھوں میں حمدیہ کتابیں تھیں۔

راہیل نے اُس کسی کو تصور میں لایا ــ جس نے اپنے کاندھوں پر رنگ کے ڈبے اٹھائے، اوپر گرجا کے گنبد تک چڑھنے کا زحمت آمیز فیصلہ کیا۔ سفید بادلوں کے لیے سفید، آسمان کے لیے نیلا، ہوائی جہازوں کے لیے چاندی، اور ساتھ میں برش اور پتلا کرنے والا محلول۔ وہ اُسے یوں دیکھتی ہے جیسے وہ ویلُتھا جیسا کوئی ہو ـــ چمکتی ہوئی کھال والا، ننگا بدن، بانس کے اسٹیج سے لٹکتا ہوا، گرجا کے اونچے گنبد میں بیٹھا آسمانی نیلے پس منظر پر چاندی جیسے جیٹ طیارے بنا رہا ہو۔ پھر راہیل نے سوچا اگر رسی ٹوٹ جائے تو کیا ہو؟ کیا وہ شخص اُس آسمان سے گرے گا جو اُس نے خود تخلیق کیا تھا؟ جیسے کوئی سیاہ تارا، اپنے ہی آسمان سے گرتا ہوا ـــ اور پھر وہ گرجا کی گرم

فرش پر بکھرا پڑا ہو، اُس کے سر سے بہتا خون — ایک خفیہ سیال کی مانند۔ تب تک راہیل اور استھا یہ جان چکے تھے کہ دنیا انسانوں کو توڑنے کے کئی اور طریقے بھی رکھتی ہے۔ وہ اُس مہک سے مانوس ہو چکے تھے — میٹھی سی، بیمار پھولوں جیسی، جیسے باسی گلاب ہوا میں تیر رہے ہوں۔

صوفی مول نے راہیل کو ایک اور چیز بھی دکھائی۔ ایک چمگادڑ کا بچہ۔ جب جنازے کی عبادت جاری تھی، راہیل نے دیکھا کہ ایک چھوٹی سیاہ چمگادڑ بے بی کوچمّا کی قیمتی جنازہ ساڑھی پر اپنی نازک، مڑی ہوئی انگلیوں سے چمٹتی ہوئی رینگ رہی تھی۔ جب وہ اُس جگہ تک پہنچی جہاں ساڑھی اور بلاؤز کے درمیان اُن کا ننگا، اُبھرا ہوا درد چھپا ہوا تھا — تو بے بی کوچمّا نے ایک دل دہلا دینے والی چیخ ماری اور ہوا میں اپنا حمد یہ کتابچہ لہرا دیا۔ گانا رک گیا۔ "کیا ہوا؟ کیا ہے؟" کی آوازیں اُبھریں۔ اور ایک "پَرپَر" اور ساڑھی کی پھڑپھڑاہٹ" پھیل گئی۔

اداس پادریوں نے اپنے گھنگھریالے داڑھیوں کو سونے کی انگوٹھیوں والی انگلیوں سے جھاڑا، جیسے کوئی اچانک مکڑیوں کے جالے بن گیا ہو۔

چمگادڑ کا بچہ اُڑ کر آسمان میں جا گھسا، اور ایک ایسے جیٹ طیارے میں بدل گیا جس کے پیچھے کوئی دھاری نہیں تھی۔ صرف راہیل نے دیکھا کہ صوفی مول نے اپنے تابوت میں ایک خفیہ قلابازی کی۔ گانا دوبارہ شروع ہوا — وہی اداس نظم، دوبارہ۔ اور زرد گرجا پھر سے ایک گلے کی طرح پھول گیا — آوازوں سے لبریز۔

جب صوفی مول کے تابوت کو گرجا کے پیچھے چھوٹے سے قبرستان میں زمین کے اندر اتارا گیا، تو راہیل جانتی تھی — وہ ابھی مری نہیں تھی۔ راہیل نے اُس کی طرف سے وہ آوازیں سنیں — سرخ مٹی کی دھیمی، اور نارنجی لیٹرائٹ کی سخت خراشیں، جو تابوت کی چمک کو کھرچ رہی تھیں۔ اُس نے وہ گمبھیر تھپتھپاہٹ سنی جو ریشم کی استر اور پالش لکڑی سے گزر کر آتی ہے۔ اداس پادریوں کی آوازیں — مٹی اور لکڑی میں مدھم ہو چکی تھیں:

"اے مہربان باپ، ہم اس ننھی روح کو تیرے حوالے کرتے ہیں"...

"اور اس کے جسم کو زمین کے سپرد، مٹی کو مٹی، راکھ کو راکھ، گرد کو گرد"...

زمین کے اندر صوفی مول نے چیخ ماری — اور ریشمی استر کو دانتوں سے چیر ڈالا۔ مگر زمین اور پتھر کے پار چیخ سنائی نہیں دیتی۔

صوفی مول اس لیے مری تھی کہ وہ سانس نہیں لے سکی۔

اُس کا جنازہ اُسے مار گیا تھا۔

"دس ٹوڈَٹ، ٹوڈَٹ، ٹو آئی/اَس، ٹو آئی/اَس"...

اُس کی قبر پر لکھا تھا:

"ایک سورج کی کرن، جو ہمیں بہت کم وقت کے لیے ملی۔"

امّو نے بعد میں سمجھایا تھا کہ **"بہت کم"** کا مطلب ہوتا ہے **"بہت تھوڑے وقت کے لیے"۔**

جنازے کے بعد امّو جڑواں بچوں کو واپس کوٹائم پولیس اسٹیشن لے گئی۔ وہ جگہ اُن کے لیے نئی نہ تھی ـــ وہ پچھلے دن کا بیشتر وقت وہیں گزار چکے تھے۔ پرانی پیشاب کی تیز، دھوئیں جیسی بو کو یاد کرتے ہوئے، دونوں نے پہلے ہی اپنی ناک بند کر لی، اس سے پہلے کہ بدبو اُن تک پہنچتی۔

امّو نے اسٹیشن ہاؤس آفیسر کا پوچھا، اور جب اسے اندر لے جایا گیا تو اُس نے کہا: ایک ہولناک غلطی ہو گئی ہے، اور وہ بیان دینا چاہتی ہے۔ اُس نے ویلُتھا کو دیکھنے کی اجازت مانگی۔

انسپکٹر تھامس میتھیو کی مونچھیں ایئر انڈیا کے مہاراجہ کی مونچھوں کی طرح لہرا رہی تھیں، مگر آنکھوں میں مکاری اور ہوس کی

چمک تھی۔

"اب یہ سب کہنے کو بہت دیر ہو گئی ہے، نہیں؟"

اُس نے کوٹائم کی بازاری ملیالم بولی میں کہا—اور امّو کے سینے پر نظریں گاڑے رکھیں۔

اُس نے کہا: پولیس کو وہ سب کچھ معلوم ہے جو جاننے کی ضرورت تھی۔ اور یہ کہ کوٹائم پولیس کسی **ویشیا** یا اُس کے **ناجائز بچوں** کا بیان نہیں لیتی۔

امّو نے جواب دیا: "یہ ہم دیکھ لیں گے۔"

انسپکٹر میز کے گرد گھوم کر سامنے آیا اور اپنے ڈنڈے کے ساتھ اُس کی طرف بڑھا۔

"اگر میں تمہاری جگہ ہوتا..." اُس نے کہا، "تو چپ چاپ گھر چلا جاتا۔"

پھر اُس نے نرمی سے—بالکل نرمی سے—اُس کے سینے پر ڈنڈا ٹک ٹک کیا۔

یوں جیسے آم کے ٹوکرے میں سے پکے ہوئے آم چنے جا رہے ہوں۔

جیسے وہ بتا رہا ہو کون سا بند ھوایا جائے، کون سا بھجوایا جائے۔

انسپکٹر تھامس میتھیو شاید جانتا تھا کسے چُھونا ہے اور کسے نہیں — پولیس والوں کی حس ہوتی ہے ایسی۔

پیچھے، دیوار پر ایک بورڈ پر لکھا تھا:

نرمی۔ اطاعت۔ وفاداری۔

ذہانت۔

شائستگی۔

مہارت۔

جب وہ پولیس اسٹیشن سے نکلے، تو امّو رو رہی تھی — اس لیے استھا اور راہیل نے اُس سے نہیں پوچھا: **ویشیا** کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ یا **ناجائز** کا؟

یہ پہلا موقع تھا جب انہوں نے اپنی ماں کو روتے دیکھا۔ وہ سسک نہیں رہی تھی، چہرہ پتھر کی طرح جَم تھا، مگر آنکھوں میں آنسو ابھر رہے تھے — اور گالوں پر بہتے جا رہے تھے۔ یہ منظر جڑواں بچوں کے لیے متلی جیسا تھا۔ امّو کے آنسوؤں نے وہ سب کچھ جو اب تک خواب لگتا تھا، ایک حقیقت میں بدل دیا تھا۔

وہ بس سے ایمنم واپس لوٹے۔

بس کنڈکٹر—خاکی کپڑوں میں لپٹا ایک تنگ سا مرد—ریلوں پر چلتا ہوا اُن کے پاس آیا۔ ایک نشست کی پشت سے کمر ٹکائی، اور ٹکٹ پنچر کو "چٹک" سے بجایا۔

"کہاں جانا ہے؟"—یہ وہ چٹک شاید پوچھنا چاہتی تھی۔ راہیل کو ٹکٹوں کے گچھے اور بس کی پٹڑیوں کی تیزابیت بھری دھات کی بو اُس کے ہاتھوں سے آتی محسوس ہوئی۔

"وہ مر گیا ہے۔" امّو نے سرگوشی میں کہا۔ "میں نے اُسے مار ڈالا ہے۔"

"ایمنم!" استھا نے جلدی سے کہا، اس سے پہلے کہ کنڈکٹر جھنجھلا جائے۔ اُس نے امّو کے پرس سے پیسے نکالے۔ کنڈکٹر نے ٹکٹ تھمائے۔ استھا نے انہیں تہہ کیا، جیب میں رکھا، اور پھر اپنے ننھے بازو امّو کے گرد لپیٹ دیے—اپنی ساکت، اشکبار ماں کو تھام لیا۔

دو ہفتے بعد، استھا کو واپس بھیج دیا گیا۔

امّو کو مجبور کیا گیا کہ وہ اُسے دوبارہ اُس کے باپ کے پاس بھیج دے ––جواب آسام کے سنسان چائے کے باغات والی نوکری سے استعفیٰ دے کر کلکتہ منتقل ہوچکا تھا، اور کاربن بلیک بنانے والی کمپنی میں نوکری کر رہا تھا۔ وہ دوبارہ شادی کر چکا تھا، پینا چھوڑ دیا تھا (تقریباً)، اور صرف کبھی کبھار پھسلتا تھا۔

استھا اور راہیل نے اُس کے بعد ایک دوسرے کو نہیں دیکھا۔

اور اب ––تیئس برس بعد —اُن کے والد نے ایک بار پھر **استھا کو واپس بھیج دیا تھا۔**

اس بار جب والد نے استھا کو واپس بھیجا، تو وہ ایک سوٹ کیس اور ایک خط کے ساتھ آیا۔ سوٹ کیس میں نفیس، چمکتے ہوئے نئے کپڑے بھرے تھے۔ بے بی کوچمّا نے راہیل کو وہ خط دکھایا۔ خط نسائی، ترچھی اور کنوینٹ اسکول کی خوشخطی میں لکھا گیا تھا، مگر دستخط اُن کے والد کے تھے ––یا کم از کم نام اُن کا تھا۔ راہیل اُس دستخط کو پہچان نہ پائی۔ خط میں لکھا تھا کہ اُن کے والد اب کاربن بلیک کی نوکری سے ریٹائر ہوچکے ہیں، اور آسٹریلیا ہجرت کر رہے ہیں، جہاں انہیں کسی سیرامکس فیکٹری میں سیکیورٹی چیف کی نوکری مل گئی ہے۔ اور یہ کہ وہ استھا کو ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ انہوں

نے ایمنم کے سب لوگوں کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا تھا، اور یہ بھی لکھا تھا کہ اگر وہ کبھی دوبارہ بھارت آئے، تو اُس سے ضرور ملیں گے — حالانکہ، انہوں نے تسلیم کیا، ایسا ہونا کچھ خاص ممکن نہیں لگتا۔ بے بی کوچمّا نے راہیل سے کہا کہ وہ چاہے تو خط رکھ سکتی ہے۔ راہیل نے خط لفافے میں واپس رکھ دیا۔ کاغذ نمی سے نرم ہو چکا تھا — جیسے کپڑا ہو، تہہ در تہہ۔

اُسے یاد نہیں تھا کہ ایمنم کی برسات کی ہوا اتنی نم ہو سکتی ہے۔ الماریاں سوجی ہوئی چیخنے لگتی تھیں، بند کھڑکیاں اچانک کھل جاتیں، کتابیں اپنے جلدوں کے اندر نرم اور لہردار ہو جاتی تھیں۔ عجیب عجیب کیڑے — جیسے کوئی خیال ہو — شام کے وقت ابھرتے، اور بے بی کوچمّا کے مدھم چالیس واٹ بلبوں پر جل کر راکھ ہو جاتے۔ دن میں، اُن کی جلی ہوئی کرچیاں فرش پر اور کھڑکیوں کی دہلیز پر بکھری ہوتیں، اور جب تک کوچو ماریا انہیں اپنے پلاسٹک کے جھاڑو سے صاف نہ کرتی، ہوا میں ایک مخصوص "کچھ جلنے" کی بُو رچی رہتی تھی۔

جون کی بارش وہی تھی۔ آسمان جیسے کھل جاتا، اور پانی اس زور سے برستا جیسے کسی بھولی بسری کہانی کی سزا دی جا رہی ہو۔ بوڑھا کنواں

دوبارہ جاگ اٹھتا، سوربنچ کا آنگن کائی سے ڈھک جاتا، اور چائے کے رنگ کی کیچڑ — جیسے یادداشت کی بمباری — ذہن کے چائے رنگی گوشوں پر چھا جاتی۔ گھاس، بھیگی ہوئی سبز مسکراہٹ بن جاتی۔ خوش باش کیچوے جامنی ہو کر کیچڑ میں اچھلتے، جنگلی بوٹیاں سر ہلاتیں، درخت جھک جاتے۔

بارش اور ہوا کے اُس شور میں، دریا کے کنارے، اچانک چھا جانے والی دن کی گرج دار تاریکی میں، استھا چل رہا تھا۔ اُس نے کچلے ہوئے اسٹرابیری گلابی رنگ کی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی، جو اب بھیگ کر گہرے رنگ میں بدل چکی تھی۔ اور وہ جانتا تھا: راہیل آ چکی ہے۔

استھا ہمیشہ سے خاموش بچہ تھا، اس لیے کوئی یہ ٹھیک سے نہیں کہہ پایا کہ اُس نے بولنا کب بند کیا۔ سال، مہینہ، دن — کوئی بھی یقین سے نہ بتا سکا۔ کیونکہ "بالکل کب" جیسی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ یہ ایک بتدریج بند ہوتی آواز کی دکان تھی۔ ایک ایسی خاموشی جو آہستہ آہستہ جسم کے اندر پھیلتی گئی، جیسے کسی نے گفتگو کے آخری جملے کے بعد بس چپ ہونا سیکھ لیا ہو۔

مگر استھا کی خاموشی کبھی اجنبی یا جارحانہ نہ تھی۔ نہ وہ الزام دیتی تھی، نہ احتجاج کرتی تھی۔ وہ تو جیسے "خاموشی کی نیند" تھی—ایک گہری، بے صدا غنودگی—جیسے نفسیاتی طور پر وہی ہو جو بارش کے موسم میں زمین میں دبک جانے والی مچھلیاں کرتی ہیں—مگر استھا کے لیے وہ خشک موسم ہمیشہ کے لیے تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ، استھا میں یہ صلاحیت پیدا ہو گئی تھی کہ وہ کسی بھی منظر کے پس منظر میں خود کو مدغم کر لے۔ کتب خانہ، باغ، پردے، دروازے، گلیاں—وہ ہر جگہ خود کو "کچھ نہ ہونا" بنا دیتا۔ ایسا بے آواز کہ اجنبیوں کو اُس کی موجودگی کا احساس ہونے میں دیر لگتی—اور جب ہو بھی جاتا، تب بھی یہ سمجھنے میں وقت لگتا کہ وہ کبھی کچھ بولتا نہیں۔ کچھ تو کبھی جان ہی نہ پائے۔ استھا دنیا میں بہت کم جگہ گھیرتا تھا۔

صوفی مول کے جنازے کے بعد، جب اُسے واپس بھیجا گیا، تو اُس کے والد نے اُسے کلکتہ کے ایک لڑکوں کے اسکول میں داخل کرا دیا۔ وہ کوئی خاص ذہین طالب علم نہ تھا، نہ ہی کمزور۔ بس ایک درمیانے درجے کا بچہ—سالانہ رپورٹس میں یہی لکھا ہوتا: "متوسط کارکردگی۔ اطمینان بخش۔" یا کبھی کبھار: "گروپ

سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیتا۔ "یہ "گروپ سرگرمیاں" کیا تھیں، کسی نے وضاحت کبھی نہیں کی۔

اسکول ختم کیا، مگر کالج جانے سے انکار کر دیا۔ اور پھر — شروع میں تو اس کے والد اور سوتیلی ماں کو شرمندگی ہوئی — لیکن استھا نے گھر کے کام خود کرنا شروع کر دیے۔ یوں جیسے وہ اپنے قیام کا کرایہ، اپنی خاموشی سے ادا کر رہا ہو۔ جھاڑو، پونچھا، کپڑے — سب خود کرتا۔ پکانا سیکھا، سبزیاں خریدنے بازار جانے لگا۔ سبزی فروش، جو چکنے، چمکتے، تیل لگے سبزی کے پہاڑوں کے پیچھے بیٹھے ہوتے، اُسے پہچاننے لگے۔ بھیڑ میں اُسے دیکھ کر توجہ دیتے۔ وہ اُسے زنگ آلود فلم کے ڈبے دیتے — جس میں وہ سبزیاں ڈال لیتا۔ نہ وہ مول تول کرتا، نہ کوئی اُسے دھوکہ دیتا۔ وزن کر کے، پیسے لے کر، وہ سبزیاں اُس کے لال پلاسٹک کے ٹوکری میں منتقل کر دیتے — نیچے پیاز، اوپر بینگن اور ٹماٹر۔ اور ہمیشہ مفت میں دھنیا کا ایک تنکا اور ہری مرچوں کی ایک مٹھی — تحفے میں۔ استھا انہیں بھیڑ سے بچاتا ہوا ٹرام میں گھر لے آتا۔ شور کے سمندر پر تیرتا ہوا ایک خاموش بلبلا۔

کھانے کے وقت، اگر اُسے کچھ چاہیے ہوتا تو خود اٹھ کر لے لیتا۔ جب خاموشی نے اُسے چھوا، تو پھر اُس کی ذات میں سرایت کر گئی

—دم گھٹاتی نمی جیسی، جو ہر کونے میں بیٹھ جاتی ہے۔ پھر وہ خاموشی اُس کے اندر دھڑکنے لگی — کسی پرانے جنینی دل کی طرح۔ وہ خاموشی اُس کے دماغ کے اندر، نرمی سے، چپ چاپ پنجے مارنے لگی —اُس کے حافظے کی ڈھلانوں پر رینگتی ہوئی، پرانے جملے نوچ لیتی، زبان کی نوک سے اُچک لیتی۔ خیالات سے اُن کے لفظ چھین لیتی۔ اور اُنہیں برہنہ، گونگا، بے جان چھوڑ دیتی۔ اور باہر سے دیکھنے والوں کو یوں لگتا جیسے وہ وہاں ہے ہی نہیں۔

آہستہ آہستہ، برسوں میں، استھا نے دنیا سے منہ موڑ لیا۔ وہ اُس اندر رہنے والے آکٹوپس کا عادی ہو گیا—جو اُس کی یادوں پر سیاہی چھڑک کر اُنہیں بے اثر کر دیتا۔ اور پھر وہ وقت بھی آیا—جب خاموشی خود ایک جواز بن گئی۔ اور اُس خاموشی کی اصل — کہیں، بہت گہرائی میں—دفن ہو گئی۔

جب خوب چند، استھا کا پیارا، اندھا، گنجا، ضعیف، اور ناقابلِ ضبط مثانے والا سترہ سالہ آوارہ کتا، اپنی موت کو طویل اور اذیت ناک بنانے پر تُل گیا، تو استھا نے اُسے یوں پالا جیسے اُس کی اپنی زندگی اسی پر منحصر ہو۔ اپنی زندگی کے آخری مہینوں میں، خوب چند—جو اپنی نیت میں نیک تھا مگر مثانے کے معاملے میں

نہایت ناقابلِ اعتماد — آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا اُس دروازے کے نیچے لگے چھوٹے ڈاگ-فلاپ تک پہنچتا جو پچھلے باغ میں کھلتا تھا، اپنا سرا اس میں گھساتا اور لرزتے بدن سے اندر ہی پیشاب کر دیتا — چمک دار پیلے رنگ کا۔ پھر، مثانہ خالی ہونے اور ضمیر صاف ہونے کے بعد، وہ اپنی اُجلی سبز آنکھوں سے استھا کو دیکھتا، جیسے کائی زدہ تالابوں میں بسا کوئی راز، اور واپس اپنے نم آسن پر لوٹ جاتا، فرش پر گیلی چاپ چھوڑتا ہوا۔

جب خوب چند مرتے مرتے اپنے کشن پر پڑا تھا، تو استھا اُس کے ہموار حامنی خصیوں میں کھڑکی کی عکس دیکھ سکتا تھا۔ اور اُس سے آگے آسمان کا۔ اور ایک بار، ایک پرندہ بھی — جو آسمان سے گزرا تھا۔ استھا کے لیے، جو پرانی گلابوں کی خوشبو اور شکست خوردہ مرد کی یادوں میں بسا ہوا تھا، یہ حقیقت کہ اتنی نازک، ناقابلِ بیان نرم شے باقی رہ گئی، موجود رہی، ایک معجزہ تھی — ایک پرواز کرتا پرندہ، ایک بوڑھے کتے کے خصیوں میں منعکس۔ اور یہ خیال اُس کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ لے آیا۔

جب خوب چند مر گیا، تو استھا نے چلنا شروع کیا۔ گھنٹوں، لگاتار چلتا رہا۔ ابتدا میں وہ محض آس پاس کے محلّے کی گشت کرتا،

مگر پھر وہ دُور دُور تک جانے لگا۔ لوگ سڑک پر اُسے دیکھنے کے عادی ہو گئے۔ ایک خاموش چال والا، صاف ستھرا لباس پہنے شخص۔ اُس کا چہرہ سخت ہو چکا تھا، کھُلے آسمان کا رنگ اختیار کر چکا تھا — جھریوں بھرا، سخت اور دریا کنارے ماہی گیر جیسا، جیسے کوئی ایسا شخص جس کے اندر سمندر کی کہانیاں بسی ہوں۔

اب جب کہ اُسے دوبارہ "واپس بھیجا" گیا تھا، وہ ایمنم کے گوشے گوشے میں چلتا پھرتا تھا۔ بعض دنوں وہ دریا کے کنارے کنارے چلتا — اُس دریا کے جو گندگی اور ان زہریلی ادویات کی بدبو سے بھرا تھا جو عالمی بینک کے قرض سے خریدی گئی تھیں۔ مچھلیوں کا بیشتر حصہ مر چکا تھا۔ جو بچ گئی تھیں، وہ پنکھوں کے سڑنے اور جسم پر نکلے پھوڑوں سے تکلیف میں مبتلا تھیں۔

کبھی وہ نئی سڑک پر نکل پڑتا — اُن چمکتے، شاندار، خلیجی ترسیلات زر سے بنے ہوئے گھروں کے سامنے سے گزرتا جو نرسوں، مزدوروں، تار کاٹنے والوں اور بینک کلرکوں نے باہر کی اذیت ناک زندگی کے بدلے یہاں تعمیر کیے تھے۔ وہ اُن پرانے گھروں کے پہلو سے گزرتا جو حسد کی ہلکی سی ہریاہٹ لیے، اپنے ربڑ کے درختوں میں ڈھکے ہوئے، اندرونی صحن

میں دبکے رہتے تھے۔ ہر ایک گھر—ایک لرزتا ہوا چھوٹا سا راج، اپنی ایک الگ داستان لیے ہوئے۔

وہ اُس گاؤں کے اسکول کے پاس سے گزرتا جو اُس کے پردادا نے چھوئے جانے کے لائق نہ سمجھے گئے بچوں کے لیے بنایا تھا۔ وہ صوفی مول کے زرد چرچ کے پاس سے گزرتا۔ ایمنم یوتھ کنگ فو کلب، "ٹنڈر بڈز" نرسری اسکول (جو صرف چھونے کے قابل بچوں کے لیے تھا)، اور اُس راشن کی دکان کے پاس سے، جہاں چاول، چینی اور کیلے بیچے جاتے تھے—پیلے رنگ کے جھرمٹ میں چھت سے لٹکتے ہوئے۔

چھت سے لٹکے رسوں پر چمڑے کے کلپ سے سستی، جنسی کہانیوں پر مبنی ساؤتھ انڈین رسالے جھولتے رہتے تھے—وہ جعلی لہو میں لتھڑی نیم برہنہ عورتوں کی تصویریں دکھا کر سچّے خریداروں کو لبھاتے۔

کبھی کبھار، استھالکی پریس کے پاس سے گزرتا—جہاں ایک زمانے میں کامریڈ کے۔ این۔ ایم۔ پلئی کی کمیونسٹ پارٹی کا دفتر ہوا کرتا تھا۔ وہی جگہ جہاں راتوں کو میٹنگیں ہوتیں، اور انقلابی ترانے چھپ کر بانٹے

جاتے۔ اب چھت پر لٹکتا لال جھنڈا مدھم اور بوسیدہ ہو چکا تھا ―سرخی بہہ گئی تھی۔

کامریڈ پلئی خود صبح کے وقت باہر نکلتے، بدن پر مرچوں والا گرم ناریل تیل ملتے، اپنے ڈھیلے ڈھالے جسم کو ہاتھوں سے مسلتے ―گوشت جیسے ہڈیوں سے الگ ہوتا چلا جاتا ہو، چیونگم کی طرح۔ وہ اکیلے رہتے تھے۔ ان کی بیوی، کلیانی، بیضہ دانی کے سرطان سے مر چکی تھی۔ بیٹا لینن دہلی جا چکا تھا، اور غیر ملکی سفارت خانوں کے ساتھ کسی سروس کمپنی میں کام کرتا تھا۔

اگر استھا اُس وقت وہاں سے گزرتا جب کامریڈ خود کو تیل لگا رہے ہوتے، تو وہ ضرور آواز دیتے:

"استھامون!" ―اپنی باریک، نچڑی ہوئی آواز میں، جو اب گنے کے چھلکے کی طرح ریشہ دار ہو چکی تھی۔

"صبح بخیر! روز کی سیر؟"

استھا گزر جاتا ―نہ بے ادب، نہ مودب۔ بس خاموش۔

کامریڈ پلئی اپنے بدن پر تھپکیاں دے کر دورانِ خون کو جگاتے۔ وہ سمجھ نہ

پاتے کہ کیا استھا نے انھیں پہچانا بھی یا نہیں۔ اور شاید وہ خاص پرواہ بھی نہیں کرتے تھے۔

حالانکہ وہ خود اُس "سب کچھ" میں بہت بڑا کردار رکھتے تھے، مگر کامریڈ پلئی نے کبھی خود کو اُس کا ذمہ دار نہ مانا۔

یہ سب ان کے نزدیک "ضروری سیاست کا ناگزیر نتیجہ" تھا۔

وہ ہمیشہ ایک سیاسی آدمی رہے تھے—ایک پیشہ ور آملیٹ ساز۔

جو گرنے والے انڈوں سے آنکھ نہیں چراتا، مگر خود کبھی نہیں ٹوٹتا۔

وہ دنیا میں گرگٹ کی طرح چلتے تھے—نہ کبھی مکمل ظاہر، نہ مکمل پوشیدہ۔

وہی پہلا شخص تھا ایمنم میں جسے راہیل کی واپسی کی خبر ملی۔

اس خبر نے اسے پریشان نہیں کیا، بلکہ تجسس سے بھر دیا۔

استھا تو اُس کے لیے تقریباً اجنبی ہو چکا تھا—اتنی اچانک اور غیر رسمی بے دخلی کے بعد، وہ بھی برسوں پہلے کی بات۔

مگر راہیل… اُسے وہ بخوبی جانتا تھا۔ اُس کی نشوونما دیکھ چکا تھا۔

اب سوچتا تھا، وہ کس لیے واپس آئی ہو گی، اتنے برس بعد؟

راہیل کی واپسی سے پہلے تک، استھا کے ذہن میں خاموشی بسی ہوئی تھی۔ مگر اُس کے ساتھ ساتھ ایک نئی دنیا بھی آ گئی تھی—ٹرینوں کے گزرنے کی آواز، کھڑکی کے پہلو سے آتی روشنی اور سایے، اور وہ بے آواز بوجھ جو دل پر گرتا ہے جب باہر کی دنیا، جو برسوں تک بند رہی ہو، یکدم اندر گھس آتی ہے۔ اور اب، اُس کے اندر صرف شور تھا—ٹرینیں، ٹریفک، موسیقی، سٹاک مارکیٹ، پرچم، زلزلے، تنہائی، تشدد، جلوس، منافقین، ستارے، وائلن، فہرستیں—سب کچھ ایک ہی چکر میں گھومتے جا رہے تھے۔

امّو کی موت کے بعد—اس دن کے بعد جب وہ ایمنم واپس آئی تھی، چہرہ کورٹیزون کے اثر سے سوجا ہوا، اور سینے میں گھنگھناتی کھانسی جیسے دور کہیں کوئی شخص پکار رہا ہو—راہیل ڈولنے لگی۔ اسکول سے اسکول۔ ہر چھٹی کی چھٹی اُس نے ایمنم میں گزاری، جہاں چاکو اور ماماچی اسے اکثر نظر انداز کرتے—اُن پر سوگ کا بوجھ تھا، جیسے کسی ٹوڈی کی دکان میں دو تھکے ہوئے نشئی بیٹھے ہوں—اور راہیل بھی بے بی کوچمّا کو نظر انداز کرنے لگی تھی۔

راہیل کی پرورش کے معاملے میں چاکو اور ماماچی نے کوشش تو کی، لیکن کر نہ پائے۔ وہ بنیادی ضروریات پوری کرتے رہے—کھانا،

کپڑے، فیس — لیکن وہ تعلق، وہ محبت جو اصل پرورش مانگتی ہے، غائب رہی۔ صوفی مول کا غم ایمنم ہاؤس میں آہستہ قدموں سے چلتا، جیسے موزوں پہنے کوئی خاموش وجود، جو کتابوں، کھانے، ماماچی کے وائلن کیس، اور چاکو کی پنڈلیوں کے زخموں کے زرد خراشوں میں چھپا ہوتا، جنہیں وہ بار بار کُھجاتا۔ اُس کی ڈھیلی، نسوانی ٹانگوں میں بھی وہ دکھ بسا ہوا تھا۔

عجیب بات یہ ہے کہ کبھی کبھار موت کی یاد خود زندگی سے کہیں زیادہ دیرپا ہو جاتی ہے۔ برسوں گزرے، اور صوفی مول کی یاد — جو چھوٹی سچائیاں پوچھتی تھی، جیسے "بوڑھے پرندے کہاں مرنے جاتے ہیں؟" یا "مرے ہوئے پرندے آسمان سے پتھروں کی طرح کیوں نہیں گرتے؟" اور جو کسی غیر ارادی سچ کو بے دھڑک کہہ دیتی تھی: "تم دونوں پورے کالے ہو، میں آدھی ہوں۔" — آہستہ آہستہ مدھم پڑنے لگی، لیکن صوفی مول کا 喪، اُس کا کھو جانا، پہلے سے زیادہ جیتا جاگتا ہو گیا۔

ہر موسم کی طرح وہ لوٹتا رہا۔

ہمیشہ وہیں، جیسے کوئی سرکاری نوکری ہو۔

اسی کے ساتھ راحیل بھی لڑکپن سے نکل کر عورت بن گئی—اسکول سے اسکول، چھان پھٹکتی ہوئی۔ گیارہ برس کی عمر میں، وہ "نصرت کانوینٹ" میں پہلی بار **بلیک لسٹ** ہوئی—جب اُسے اپنی ہاؤس مسٹریس کے باغ کے دروازے کے باہر، تازہ گوبر کی ڈھیری پر چھوٹے چھوٹے پھول چڑھاتے دیکھا گیا۔
اگلی صبح اسمبلی میں اُسے "depravity" کا مطلب ڈھونڈنے کا کہا گیا—آکسفورڈ ڈکشنری میں سے—اور بلند آواز میں سنانا پڑا:
"اخلاقی بگاڑ کی کیفیت یا حالت؛ گمراہی؛ فطری گناہ کی بنا پر انسانی فطرت کی اندرونی خرابی؛ منتخب اور غیر منتخب، دونوں اس دنیا میں مکمل گناہ اور خدا سے بیگانگی کی حالت میں آتے ہیں، اور اپنی مرضی سے صرف گناہ ہی کر سکتے ہیں۔"—جے ایچ بلنٹ

چھ ماہ بعد، اسے اسکول سے نکال دیا گیا—سینیئر لڑکیوں کی شکایات پر۔ اُس پر (درست طور پر) الزام تھا کہ وہ دروازوں کے پیچھے چھپ کر سینیئر لڑکیوں سے ٹکرا جاتی تھی۔ جب پرنسپل نے اُس کے رویے کے بارے میں سوال کیا (نرمی، سزا، بھوک سے)، تو آخرکار اُس نے مان

لیا کہ وہ یہ سب اس لیے کرتی تھی تا کہ دیکھ سکے: کیا سینہ چوٹ کھانے سے دُکھتا ہے؟

اُس عیسائی ادارے میں "سینے" کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ وہ گویا موجود ہی نہیں تھے۔

)اور اگر موجود نہیں، تو کیا دُکھ سکتے تھے؟(

یہ پہلی "نکال" تھی۔

دوسری بار وہ "سگریٹ پینے" پر نکالی گئی۔

تیسری بار اس لیے کہ اُس نے اپنی ہاؤس مسٹریس کے جھوٹے بالوں کے جوڑے کو آگ لگادی—جو، دباؤ کے تحت، اُس نے قبول کیا کہ چرایا تھا۔

جن جن اسکولوں میں وہ گئی، وہاں اس کے بارے میں ہمیشہ دو باتیں لکھی جاتیں:

(الف) وہ حد درجہ مؤدب بچی ہے۔

(ب) اُس کے کوئی دوست نہیں۔

یہ گویا شائستگی میں لپٹی تنہائی کی کوئی خاص قسم کی خرابی تھی۔

اور اسی لیے اس پر سختی سے غور کیا جاتا۔

اساتذہ اپنے ناپسندیدگی کے مزے لیتے، زبان سے چکھتے، جیسے کوئی میٹھا چوس رہے ہوں۔

وہ آپس میں سرگوشی کرتے:

"جیسے اُسے لڑکی ہونا آتا ہی نہیں۔"

اور وہ کچھ غلط نہ کہتے تھے۔

غیر توجہ، حیرت انگیز طور پر، اُس کی روح کو ایک اتفاقیہ رہائی دے گئی۔ راحیل بڑی ہوئی بغیر کسی "پروگرام" کے۔ بغیر کسی کے جو اُس کی شادی طے کرے، جو اُس کے جہیز کا بندوبست کرے—اور یوں، بغیر کسی واجب شوہر کے جو اُس کے افق پر سایہ ڈالے۔

لہٰذا جب تک وہ زیادہ شور نہ کرتی، اُسے آزادی حاصل تھی کہ وہ اپنی دریافتیں خود کرے:

کیا سینے دُکھتے ہیں؟

جھوٹے جوڑے کیسے جلتے ہیں؟

زندگی کو جینا کیسے چاہیے؟

جب اسکول مکمل ہوا، تو اُس نے دہلی کے ایک درمیانے درجے کے آرکیٹیکچر کالج میں داخلہ لیا۔

نہ یہ کسی شوق کا نتیجہ تھا، نہ دلچسپی کا۔

بس داخلہ امتحان دیا اور ہو گیا۔

اساتذہ اُس کے خاکے دیکھ کر متاثر ہوئے—ان کے سائز سے، ہنر سے نہیں۔

بے پروا، بے فکری سے کھینچی لکیروں کو "اعتماد" سمجھا گیا، حالانکہ وہ کبھی فنکار تھی ہی نہیں۔

اُس نے پانچ سالہ کورس کو آٹھ برس میں مکمل بھی نہ کیا، اور ڈگری بھی حاصل نہ کی۔

فیس کم تھی۔ ہاسٹل میں رہنے، سبسڈی والے میس میں کھانے، اور کلاسز چھوڑ کر، سستے معمارانہ دفتروں میں بطور ڈرافٹس وومن کام کرنے سے گزر اوقات ہو جاتی تھی۔

دیگر طلبا—خاص طور پر لڑکے—اُس کی بے نیازی اور شدید غیر حریص فطرت سے خوفزدہ ہو جاتے، اور اُسے اکیلا چھوڑ دیتے۔

نہ دعوتیں، نہ تقریبات، نہ دوستی۔

اُس کے پروفیسر بھی اُس سے ہچکچاتے تھے—اُس کے عجیب،
غیر عملی نقشے، سستے براؤن کاغذ پر بنے ہوئے، اور اس کی بے پرواہ
خاموشی، اُن کی پرجوش تنقیدوں کے سامنے۔

کبھی کبھار وہ چاکو اور ماماچی کو خط لکھتی تھی۔
مگر کبھی ایمنم واپس نہ آئی—نہ جب ماماچی مریں، نہ جب
چاکو کینیڈا چلا گیا۔

راہیل کی ملاقات لیری میک کاسلِن سے اُس وقت ہوئی جب
وہ آرکیٹیکچر کے کالج میں تھی۔ لیری دہلی آیا ہوا تھا—اپنے ڈاکٹری
مقالے کے لیے مواد جمع کرنے، جو "روایتی طرزِ تعمیر میں توانائی کی
بچت" پر تھا۔ اُس نے پہلی بار راہیل کو کالج کی لائبریری میں
دیکھا، اور پھر چند روز بعد خان مارکیٹ میں۔ وہ جینز اور
سفید ٹی شرٹ میں ملبوس تھی۔ ایک پرانی چیتھڑوں والی
لحاف کا ٹکڑا اُس کی گردن سے بٹن لگا کر بندھا ہوا تھا، جو اُس کے
پیچھے کسی چادر کی مانند لٹک رہا تھا۔ اُس کے الجھے ہوئے بال پیچھے
باندھے گئے تھے تاکہ سیدھے نظر آئیں—حالانکہ وہ تھے نہیں۔ ایک
چھوٹا سا ہیرے کا ٹکڑا اُس کی ناک کے نتھنے میں جھلملا رہا تھا۔
اُس کی ہنسلی کی ہڈیاں حد سے زیادہ خوبصورت تھیں، اور اُس کا دوڑنے کا

انداز کسی ایتھلیٹ جیسا تھا۔"یہ تو کوئی جاز دھن ہے"—لیری نے سوچا، اور اُس کے پیچھے کتابوں کی ایک دکان میں چلا گیا، جہاں دونوں میں سے کسی نے بھی کتابیں نہیں دیکھیں۔

راہیل نے شادی میں یوں قدم رکھا جیسے کوئی مسافر ایئرپورٹ کے انتظار گاہ میں کوئی خالی کرسی دیکھ کر اُس پر بیٹھ جاتا ہے—بس بیٹھنے کا احساس، کوئی خاص فیصلہ نہیں۔ وہ لیری کے ساتھ بوسٹن چلی گئی۔ لیری جب اُسے اپنی باہوں میں لیتا، اُس کا گال اپنے دل سے لگاتا، تو وہ اتنا لمبا ہوتا کہ راہیل کے سر کی چوٹی، اُس کے بالوں کی اندھیری گچھا، اُسے نظر آتی۔ جب وہ اپنی انگلی راہیل کے لب کے کونے پر رکھتا، تو ایک ہلکی سی دھڑکن محسوس ہوتی—وہ اُس جگہ سے محبت کرتا تھا۔ اور اُس ہلکی سی، ڈولتی ہوئی جنبش سے بھی، جو جلد کے نیچے، نہایت دھیرے سے دوڑتی۔ وہ اُسے یوں تھامے رکھتا، جیسے کوئی قیمتی تحفہ—محبت میں دیا گیا کچھ چھوٹا، پرسکون، ناقابلِ بیان قیمتی۔

مگر جب وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے، تو لیری کو راہیل کی آنکھوں سے شکایت ہوتی۔ اُن آنکھوں کا انداز ایسا ہوتا، جیسے وہ کسی اور کی ہوں—کوئی اور جو کھڑکی سے باہر دیکھ رہا ہو، دریا پر کسی کشتی کو، یا

دھند میں سے گزرتے کسی ہیٹ والے اجنبی کو۔ لیری الجھن میں تھا—اُسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ نظر کیا کہنا چاہتی ہے۔ اُس نے اُسے "لاتعلقی اور نااُمیدی" کے بیچ کہیں رکھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ایسی جگہوں میں، جہاں راہیل جیسی عورتیں پیدا ہوتی ہیں، کئی طرح کی مایوسیاں آپس میں برتری کی جنگ لڑتی ہیں۔ جہاں ذاتی کرب کبھی اتنا شدید نہیں ہو سکتا کہ پوری قوم کے پاگل پن سے مقابلہ کر سکے۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ جب ذاتی درد، ایک عظیم، چکراتی، دیوانی، ناقابلِ فہم، اور غیر عملی عوامی اضطراب کے مزار پر حاضری دیتا ہے، تو وہاں **بڑا خدا** کسی گرم ہوا کی مانند چنگھاڑتا ہے—سجدہ چاہتا ہے۔ اور پھر **چھوٹا خدا** —جو نجی، محدود، نرم اور گھریلو ہوتا ہے—اپنی ہنسی میں جھلس جاتا ہے۔ وہ اپنی بے وقعتی کی تصدیق سے سُن ہو جاتا ہے—مزاحمت چھوڑ دیتا ہے۔ کچھ بھی اہم نہیں لگتا۔ اور جتنا کم اہم لگتا ہے، اُتنا ہی کم ہو جاتا ہے۔

کیونکہ بدتر چیزیں ہو چکی ہوتی ہیں۔

اُس ملک میں، جہاں راہیل پیدا ہوئی تھی — جو ہمیشہ جنگ کے خوف اور امن کے دہشت کے درمیان جھولتا رہتا ہے — وہاں ہمیشہ کچھ بدتر ہوتا رہتا ہے۔

تو چھوٹا خدا کھوکھلا ہنستا ہے، اور خوشی خوشی دوڑ جاتا ہے۔

جیسے کوئی امیر لڑکا ہاف پینٹ میں سیٹیاں بجاتا، پتھر ٹھوکر مارتا پھرتا ہو۔

اُس کی یہ نرم، کمزور سی شادمانی، صرف اسی نسبت سے تھی کہ اُس کی بدبختی چھوٹی تھی۔

وہ لوگوں کی آنکھوں میں گھس جاتا ہے — ایک بے حد اذیت ناک تاثر بن کر۔

لیری میک کاسلِن نے راہیل کی آنکھوں میں جو کچھ دیکھا، وہ مایوسی نہیں تھی،

بلکہ ایک زبردستی کی گئی خوش دلی تھی —

اور ایک خلا، وہاں جہاں کبھی آنسو ہوا کرتے تھے، اب استھا کے الفاظ ہوتے تھے۔

اور یہ سب وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

کہ ایک جڑواں کا سکوت، دوسرے کی خاموشی کی ہی ایک اور شکل تھی —

وہ دونوں ایک دوسرے میں گھسے ہوئے چمچوں کی طرح،

محبت کرنے والے ان جسموں کی مانند، جو پہچان سے قریب ہوں۔

طلاق کے بعد، راہیل نے کچھ مہینے نیویارک کے ایک

ہندوستانی ریستوران میں ویٹریس کی حیثیت سے کام کیا۔

پھر کئی برس واشنگٹن کے باہر ایک پٹرول پمپ پر، جہاں وہ

بلٹ پروف کیبن میں رات کی شفٹ پر ہوتی تھی۔

وہاں کبھی کبھار شرابی نقدی مشین میں قے کر دیتے،

دلال اُسے نفع بخش نوکریوں کی پیشکش کرتے۔

دو بار اُس نے مردوں کو گولی کھاتے دیکھا—کار کی کھڑکیوں سے۔

اور ایک بار، ایک خنجر زدہ آدمی کو—جسے چلتی گاڑی سے باہر پھینک دیا

گیا، پیٹھ میں چاقو پیوست۔

پھر بے بی کوچمّا نے خط لکھا:

"استھا واپس آگیا ہے۔"

راہیل نے اپنی پٹرول پمپ والی نوکری چھوڑ دی۔

خوشی خوشی۔

امریکہ کو چھوڑا۔

واپس ایمنم لوٹی—بارش میں، استھا کے پاس۔

پہاڑی پر واقع اُس پرانے گھر میں،

بے بی کوچمّا کھانے کی میز پر بیٹھی ہوئی ایک بوڑھے ککڑی کو رگڑ رگڑ کر

اُس کی جھاگ دار تلخی نکال رہی تھی۔

اُس نے چیک دار سیر سکر کی ڈھیلی نائٹ گاؤن پہن رکھی تھی—

پف آستینوں والی—جس پر ہلدی کے زرد دھبے تھے۔

میز کے نیچے اُس کے ننھے، پالش شدہ پیر جھول رہے تھے—

بالکل کسی چھوٹے بچے کی طرح، جو اونچی کرسی پر بیٹھا ہو۔

اُن میں سوجن تھی، جیسے ہوا سے بھرے چھوٹے جوتے ہوں۔

پرانے دنوں میں، جب کبھی کوئی ایمنم آتا، بے بی کوچمّا اُس کے بڑے

پیر پر تبصرہ کرتی۔

وہ اُس کے چپل مانگ کر پہنتی، کہتی، "دیکھو، میرے لیے کتنے بڑے

ہیں"!

پھر گھر میں چکر کاٹتی، ساڑی تھوڑا سا اٹھا کر، تاکہ ہر کوئی اُس

کے ننھے پیروں کو سراہ سکے۔

اب وہ ککڑی کو چھیلتے ہوئے ایک دبی دبی فتح مندی میں مصروف تھی۔

اُسے خوشی تھی کہ استھا نے راہیل سے بات نہیں کی۔

کہ وہ اُسے دیکھ کر گزر گیا تھا—

اسی طرح جیسے وہ ہر ایک سے گزر جاتا تھا—بارش میں، خاموشی سے۔

وہ تراسی برس کی ہو چکی تھی۔ اُس کی آنکھیں اُس کے چشمے کے پیچھے مکھن کی طرح پھیلی ہوئی لگتی تھیں۔

"میں نے کہا تھا نا؟" اُس نے راہیل سے کہا، "تمہیں کیا امید تھی؟ کوئی خاص سلوک؟ اُس کا دماغ خراب ہو چکا ہے، میں کہتی ہوں! اُسے لوگ یاد ہی نہیں رہتے! تم نے کیا سوچا تھا؟"

راہیل نے کچھ نہیں کہا۔

مگر وہ استھا کے جھولنے کی لَے کو محسوس کر سکتی تھی۔

اُس کی بھیگی ہوئی جلد پر بارش کی نمی، اور اُس کے دماغ میں گونجتی بکھری ہوئی دنیا کی آواز۔

بے بی کوچمّا نے بے چینی سے راہیل کی طرف دیکھا۔

اب اُسے افسوس ہو رہا تھا کہ اُس نے راہیل کو استھا کی واپسی کی خبر دی۔

مگر اور کیا کرتی؟

کیا وہ باقی عمر کے لیے اُسے سنبھالتی رہتی؟

کیوں؟

وہ اُس کی ذمہ داری تو نہیں تھی۔

یا... شاید تھی؟

خاموشی نواسی اور نانی جیسی خالہ کے بیچ یوں بیٹھی تھی، جیسے کوئی تیسرا وجود ہو—اجنبی، سوجا ہوا، بدبُودار۔

بے بی کوچمّا نے دل میں یاد دلایا:

رات کو کمرے کا دروازہ بند رکھنا ہے۔

وہ کوئی بات سوچنے کی کوشش کرنے لگی۔

"میرا نیا ہیر اسٹائل کیسا لگا؟"

اُس نے ککڑی والے ہاتھ سے اپنے بالوں کو چھوا—

کچے ککڑی کے جھاگ کا ایک لجلجا سا نشان وہاں رہ گیا۔

راہیل کے ذہن میں کوئی جواب نہیں آیا۔

وہ بے بی کوچمّا کو ککڑی چھیلتے ہوئے دیکھتی رہی۔

پیلا چھلکا اُس کے سینے پر جھڑ رہا تھا۔

اُس کے بال—جیٹ بلیک رنگ سے رنگے—اُس کے سر پر ایسے ترتیب دیے گئے تھے جیسے کھلا ہوا دھاگہ لپیٹا گیا ہو۔

رنگ اُس کے ماتھے کی جلد پر بھی پھیل گیا تھا—ایک ہلکی سی سائے دار دوسری مانگ جیسا۔

راہیل نے دیکھا: اب وہ میک اپ کرنے لگی تھی—لپ اسٹک، کاجل، گالوں پر ہلکی سی لالی۔

اور چونکہ گھر اندھیرا، بند، اور صرف چالیس واٹ بلبوں پر زندہ تھا—

تو لپ اسٹک اُس کے اصلی ہونٹوں سے ہٹ کر کچھ اور جگہ پر چمک رہی تھی۔

اُس کے چہرے اور کندھوں کا وزن کم ہو چکا تھا، جس نے اُسے گول مٹول انسان سے مخروطی ساخت دے دی تھی۔

مگر جب وہ کھانے کی میز پر بیٹھی تھی، اُس کی چوڑی کمر چھپی

ہوئی تھی—

وہ تقریباً نازک نظر آ رہی تھی۔

مدھم روشنی میں، اُس کے چہرے کی جھریاں غائب ہو چکی تھیں—

اور وہ، کسی بے وقت، اندر سے خالی جوانی کی طرح،

پھر سے تھوڑی جوان لگ رہی تھی۔

وہ بہت سا زیور پہن رہی تھی—

راہیل کی مُردہ نانی کا زیور۔

سب کچھ تھا۔ چمکتی ہوئی انگوٹھیاں۔ ہیرے کی بالیاں۔ سونے کی چوڑیاں اور خوبصورتی سے تراشی گئی ایک سادہ سونے کی زنجیر، جسے وہ وقتاً فوقتاً چھوتی رہتی، جیسے خود کو یاد دلاتی ہو کہ وہ اب بھی وہیں ہے، اور اب بھی اُسی کی ہے۔ جیسے کوئی نئی نویلی دلہن اپنی خوش نصیبی پر یقین نہ کر پائے۔

"**یہ تو زندگی اُلٹی جی رہی ہے**"، راہیل نے سوچا۔

یہ ایک عجیب مگر بے حد درست مشاہدہ تھا۔

بے بی کوچمّا نے واقعی زندگی اُلٹی ترتیب سے گزاری تھی۔

جوانی میں اُس نے دنیاداری سے دستبرداری اختیار کی، اور اب

بڑھاپے میں، اُسے گلے لگا رہی تھی — اور دنیا داری نے اُسے واپس گلے لگایا تھا۔

جب وہ اٹھارہ برس کی تھی، بے بی کوچمّا کو ایک خوبرو آئرش راہب سے محبت ہو گئی — **فادر مُلّیگن** سے — جو مدرسہ مدراس سے ایک سال کے تبادلے پر کیرالہ آیا تھا۔
وہ ہندو مذہبی متون کا مطالعہ کر رہا تھا — تاکہ بعد میں اُن پر بہتر تنقید کر سکے۔

ہر جمعرات کی صبح، فادر مُلّیگن ایمنم آتا — بے بی کوچمّا کے والد، ریورینڈ ای۔ جان آئیپ سے ملنے، جو مار تھوما چرچ کے پادری تھے۔
ریورینڈ آئیپ عیسائی برادری میں معروف تھے — وہ واحد آدمی تھے جنھیں **پاتریارک آف انطاکیہ** نے ذاتی طور پر برکت دی تھی — ایک واقعہ جو ایمنم کی لوک کہانیوں کا حصہ بن گیا تھا۔

۱۸۷۶ء میں، جب بے بی کوچمّا کے والد سات سال کے تھے، اُن کے والد انہیں پاتریارک سے ملوانے کوچی لے گئے تھے، جو کیرالہ کے شامی عیسائیوں سے ملنے آئے تھے۔ موقع ملتے ہی اُن کے والد نے بیٹے کو آگے بڑھایا — چھوٹے ریورینڈ نے، ایڑھیوں پر پھسلتے، خوف سے جمے ہونٹوں سے،

پاتریارک کی درمیانی انگلی کی انگوٹھی چوم لی—انگوٹھی پر تھوک کی تہہ جم گئی۔پاتریارک نے آستین سے انگوٹھی پونچھی اور بچے کو برکت دی۔

بعد میں وہ خود بھی پادری بنے، مگر اُنہیں ہمیشہ **"پُنّین کنجھو"** — "چھوٹا بابرکت بچہ" کہا جاتا رہا۔لوگ ایلپی، ارناکولم سے کشتیوں میں بچوں کو لے کر آتے—صرف اُس کی دعا لینے۔

حالانکہ فادر مُلّیگن اور ریورینڈ آئیپ میں عمر کا بڑا فرق تھا—اور دونوں الگ الگ کلیسیاؤں سے تھے(جن کے درمیان صرف باہمی بدگمانی مشترک تھی)—دونوں ایک دوسرے کی صحبت سے لطف اندوز ہوتے تھے۔اکثر فادر مُلّیگن دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھاتا۔

مگر اُن دونوں میں سے صرف ایک شخص یہ جانتا تھا کہ وہ نازک لڑکی، جو کھانے کے بعد میز کے گرد منڈلاتی تھی، اُس کے دل میں کیا **طوفان** اُٹھتا ہے۔

ابتدا میں، بے بی کوچمّا نے ہر جمعرات کو "خیرات" کے مظاہرے سے فادر مُلّیگن کو لبھانے کی کوشش کی۔وہ ایک غریب بچے کو جبراً کنویں پر نہلاتی—سخت، سرخ صابن سے—جس سے اُس کے اُبھرے ہوئے پسلیوں والے جسم پر چوٹ لگتی۔

"صبح بخیر، فادر!"—وہ مسکرا کر کہتی،

حالانکہ اُس کے ہاتھ اُس نازک بچے کے صابن زدہ بازو کو چمٹے ہوئے ہوتے۔

فادر مُلّیگن، چھتری بند کرتے، مسکراتے:

"صبح بخیر، بے بی!"

پھر وہ بائبل سے کوئی سوال کرتی—کوئی آیت، کوئی الجھن۔

"پہلا کرنتھیوں، باب دس، آیت ۲۳، فادر... 'سب کچھ میرے لیے جائز ہے، مگر سب کچھ فائدہ مند نہیں'—کیا واقعی سب کچھ جائز ہو سکتا ہے؟"

فادر مُلّیگن اُس جوان لڑکی کے جذبات سے خالی نہیں تھا۔ اُس کے انگاروں جیسے آنکھیں، لرزتے ہونٹ—اور اُسے دیکھتی ہوئی آنکھیں، جس میں نہاں وعدے جھلملاتے تھے—اُس سے نظریں چُرانا آسان نہ تھا۔

اور یوں، ہر جمعرات، جھلستی دوپہر میں وہ دونوں—

ایک نازک لڑکی، ایک جوشیلے یسوعی راہب—بائبل کے بہانے ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے۔

اور وہ بچہ، جیسے صابن سے کھینچا جاتا، اکثر پھسل کر بھاگ نکلتا۔
تب فادر مُلّیگن چونک جاتا:
"اوہ! اُسے سردی لگنے سے پہلے پکڑنا ہوگا"!
اور پھر اپنی چاکلیٹی رنگت کی راہبانی پوشاک سنبھالتا،
سینڈل پہن کر روانہ ہو جاتا—
اونچے قدموں پر اُٹھتے کسی اونٹ کی طرح—
پیچھے پیچھے بے بی کوچمّا کا دل، زخم زخم، پتوں اور کنکروں سے ٹکرا کر، گھسٹتا ہوا۔

پورا ایک سال یوں گزرا۔
اور پھر، فادر مُلّیگن کو واپس مدراس جانا تھا۔

اب چونکہ خیرات سے کچھ حاصل نہ ہوا، بے بی کوچمّا نے آخری سہارا "ایمان" کو بنایا۔
ایک بے مثال ضد کے ساتھ—جو اُس وقت کی لڑکیوں میں **کسی جسمانی معذوری** کی مانند ناپسند کی جاتی تھی—اُس نے اپنے باپ کی مرضی کے خلاف، **رومن کیتھولک** مذہب قبول کیا، اور ویٹیکن سے خصوصی اجازت لے کر **مدراس کے کانوینٹ** میں تربیت کے لیے داخل ہو گئی۔

اُسے امید تھی، شاید اب وہ فادر مُلّیگن کے قریب ہو سکے گی—
شاید کسی بھاری مخملی پردے والے کمرے میں وہ دونوں
"الٰہیات" پر بحث کریں گے۔
وہ اُسے دیکھنا چاہتی تھی—صرف دیکھنا، اتنا ہی خواب تھا۔
اُس کی داڑھی کی خوشبو، اُس کے جبے کے کھردرے دھاگے، اُس
کا وجود—
بس قریب رہنے کا موقع ہو۔
لیکن جلد ہی اُسے اپنی سعی کی لاحاصل ہونے کا احساس ہو گیا۔
کانوینٹ میں بڑی سسٹرز، پادریوں اور بشپوں کو اپنی "اعلیٰ بائبل فہمی"
سے گھیر لیتی تھیں۔
فادر مُلّیگن تک پہنچنے میں برسوں لگ سکتے تھے۔
وہ اُکتاہٹ اور بے چینی میں مبتلا ہو گئی۔ اُس کے سر پر مستقل
نقاب رگڑ کھاتا، اور وہاں ضدی الرجی نمودار ہو گئی۔
وہ سمجھتی تھی کہ اُس کی انگریزی سب سے بہتر ہے—
اور یہی اُسے سب سے زیادہ تنہا کر دیتا۔

ایک سال کے اندر، اُس کے والد کو خطوط آنے لگے — حیرت انگیز اور الجھانے والے:

"میرے پیارے پاپا،
میں لیڈی کی خدمت میں خوش ہوں،
لیکن کوہِ نور اداس اور گھر کی یاد میں مبتلا ہے۔"

پھر:

"میرے پیارے پاپا،
آج کوہِ نور کو دوپہر کے کھانے کے بعد قے آئی ہے،
اور وہ تیز بخار میں مبتلا ہے۔"

ریوریند آئیپ سوچ میں پڑ گئے:
یہ کوہِ نور کون ہے؟
اور یہ مسلمان نام رکھنے والی لڑکی کیتھولک کانوینٹ میں کیا کر رہی ہے؟

مگر یہ بے بی کوچمّا کی ماں تھی جس نے سچائی کو پہچانا —
کوہِ نور، خود اُس کی بیٹی تھی۔

کبھی کبھار، بے بی کو چمّا کو اُس کے دادا کی وصیت دکھائی گئی تھی—
جس میں اُس نے لکھا تھا:

"میرے سات نایاب جواہرات ہیں،
اور اُن میں سے ایک میری کوہِ نور ہے۔"

بے بی کو چمّا نے بے بنیاد سمجھ لیا—کہ وہی کوہِ نور ہے۔
اب، برسوں بعد، وہی عرفیت استعمال کر رہی تھی—
کیونکہ کانوینٹ کی مدر سپیریئر ہر خط پڑھتی تھی—
اور یہ اُس کی خاموش احتجاجی زبان بن گئی تھی۔

ریورینڈ آئیپ مدراس گئے، بیٹی کو واپس لے آئے۔
وہ خوشی سے آئی، مگر زور دیا کہ دوبارہ مذہب نہیں بدلے گی۔
تمام عمر وہ **رومن کیتھولک** رہی۔

چونکہ اب اُس کی "بدنامی" ہو چکی تھی،
باپ جانتا تھا کہ اُس کے لیے رشتہ آنا مشکل ہے۔
چنانچہ اُسے تعلیم دلوانے کا فیصلہ کیا—
امریکہ کی یونیورسٹی آف روچسٹر میں۔

دو سال بعد، بے بی کوچمّا روچسٹر سے واپس لوٹی—آرنامینٹل گارڈننگ یعنی سجاوٹی باغبانی کے ڈپلومے کے ساتھ—مگر فادر مُلّیگن کے عشق میں پہلے سے بھی زیادہ ڈوبی ہوئی۔ اب اُس میں اُس باریک، پر کشش لڑکی کی کوئی جھلک نہ تھی جو کبھی تھی۔ روچسٹر میں، وہ بہت بڑی ہو چکی تھی۔ بلکہ سچ کہا جائے تو، موٹی ہو چکی تھی۔ یہاں تک کہ، جو دبلا پتلا "چلّپن درزی" تھا، چنگم پُل کے پاس—وہ بھی اُس کی ساڑھی کے بلاؤز کے لیے بش شرٹ کا ریٹ لیتا۔ اُسے ماضی میں گم ہونے سے روکنے کے لیے، اُس کے والد نے اُسے ایمنم ہاؤس کے سامنے والے باغ کا چارج دے دیا۔

بے بی کوچمّا نے وہاں ایک وحشی، کڑوا باغ اگایا—جسے دیکھنے لوگ کوٹائم سے آتے۔ یہ باغ گول تھا، ڈھلوان پر واقع، جس کے گرد بجری کی سڑک گولائی میں مڑتی۔ اُس نے وہاں چھوٹے قد کے پودے، چٹانیں اور عجیب و غریب مجسمے لگائے۔ اُس کا سب سے محبوب پھول تھا: این تھوریم اینڈریانم۔ اُس کے پاس این تھوریم کی جاپانی اقسام، "روب رم"، "ہنی مون" اور دیگر نایاب نسلیں تھیں۔ اُن کے پھول—گوشت دار اور چمکیلے—کبھی کالے دھبوں والے، کبھی خون کے رنگ جیسے، کبھی چمکتے نارنجی۔ درمیان میں اُبھرے ہوئے، پیلے

رنگ کے کلس، جیسے چھوٹے پیتلے انگور۔ باغ کے بیچوں بیچ، کانا اور فلوکس کے پھولوں کے تختوں کے درمیان، ایک سنگ مرمر کا فرشتہ مسلسل چاندی رنگ کا قوس نما پانی ایک چھوٹے حوض میں گراتا، جس میں ایک نیلا کنول کھلا ہوتا۔ حوض کے چاروں کونوں پر گلابی رنگ کے پلاسٹر کے بونوں کی مورتی، سرخ ٹوپیاں، گالوں میں لالی، یوں بیٹھی ہوتی جیسے شرارتی خواب دیکھ رہے ہوں۔

بے بی کوچمّا دوپہریں اپنے باغ میں گزارتیں — ساڑھی پہنے، گم بوٹ میں، بڑے بڑے قینچی جیسے باغبانی کے کٹر ہاتھوں میں، چمکدار نارنجی دستانوں میں۔ جیسے شیر کے سامنے کسی سدھانے والی عورت — وہ پھنسی ہوئی بیلوں کو قابو میں لاتی، کانٹے دار کیکٹس کو پروان چڑھاتی، بونسائی کو محدود کرتی، نایاب آرکڈ کو ناز سے پالتی۔ وہ موسم سے برسرِپیکار تھی۔ ایڈیلوائس اور چائنیز گواوا اگانے کی کوشش کرتی۔ ہر رات وہ اپنے پیروں پر اصلی کریم لگاتی، اور ناخنوں کے کٹیکل کو دھکیلتی۔ لیکن پھر، پچاس سال کی مسلسل نگہداشت کے بعد، باغ کو اچانک چھوڑ دیا گیا۔ وہ خودرو ہو گیا — ایسا جنگل بن گیا، جیسے سرکس کے وہ جانور، جنھوں نے اپنے کرتب بھلا دیے ہوں۔

کمیونسٹ پیچّا نامی ایک جنگلی بیل — جو کیرالہ میں کمیونزم کی طرح

پھیلتی تھی ـــ سب پودوں کو دبا گئی۔ صرف بیلیں بڑھتی رہیں ـــ جیسے مردہ جسم کے ناخن۔ وہ بیلیں گلابی پلاسٹر کے بونوں کی ناک میں گھس جاتیں، اور ان کے کھوکھلے سروں میں پھول کھلاتیں۔ جیسے وہ حیرت اور چھینک کے بیچ کہیں پھنس گئے ہوں۔

اور یہ سب کیوں ہوا؟ کیونکہ بے بی کوچمّا نئی محبت میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اُس نے ایمنم ہاؤس کی چھت پر سیٹلائٹ ڈش نصب کر لی تھی۔ اور اب وہ اپنے ڈرائنگ روم میں پوری دنیا پر حکومت کرتی تھی ـــ سیٹلائٹ ٹی وی پر۔ یہ جوش کسی تدریجی عمل کا نتیجہ نہ تھا ـــ یہ ایک ہی رات میں ہو گیا۔ بلونڈ، جنگیں، قحط، فٹبال، جنسیات، موسیقی، انقلاب ـــ سب ایک ہی ٹرین میں آ گئے تھے۔ ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ اور ایمنم میں، جہاں کبھی سب سے اونچی آواز کوئی بس کا ہارن ہوتی تھی ـــ اب پورے قحط، فسادات، تصویری قتلِ عام اور بل کلنٹن ٹی وی پر "طلب" کیے جا سکتے تھے۔

اور جب اُس کا باغ مرجھا گیا، تو بے بی کوچمّا نے امریکی باسکٹ بال لیگ، ون ڈے کرکٹ، اور گرینڈ سلم ٹینس دیکھنے شروع کیے۔ ہفتے کے دنوں میں وہ The Bold and the Beautiful

اور Santa Barbara دیکھتی—جہاں پرفیوم زدہ، ہئیر اسپرے سے جمی ہوئی بلونڈ عورتیں انڈروئیڈز کو بہکاتیں اور اپنی جنسی سلطنتیں بچاتیں۔ بے بی کوچمّا کو اُن کے چمکدار کپڑے اور تیز طرار جملے بہت پسند تھے۔ دن کے وقت اُن ڈراموں کے ٹکڑے اُس کے ذہن میں آتے، اور وہ تنہا قہقہے لگا دیتی۔

کوچو ماریا—وہ چھوٹے قد کی تیز مزاج باورچن—اب بھی وہی موٹے سونے کے جھمکے پہنتی، جنہوں نے اُس کے کان بگاڑ دیے تھے۔ کوچو ماریا کو WWF ریسلنگ پسند تھی—جہاں ہلک ہوگن اور مسٹر پرفیکٹ، جن کی گردنیں ان کے سروں سے چوڑی تھیں، چمکدار لباس پہن کر ایک دوسرے کو وحشیانہ انداز میں مارتے۔ کوچو ماریا کی ہنسی میں وہی ہلکی سی سفاکی تھی جو بچوں کی ہنسی میں کبھی کبھار ہوتی ہے۔

دن بھر وہ دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھتیں—بے بی کوچمّا لمبی بازو والی پلانٹر کرسی یا چاپائزلانگ پر، (جو اُس کے پاؤں کی حالت پر منحصر ہوتا)، اور کوچو ماریا فرش پر—چینل گھماتی، جب موقع ملتا۔ دونوں ٹی وی کی شور بھری خاموشی میں جُڑی ہوتیں—ایک کے بال برف جیسے سفید، دوسری کے کوئلے جیسے کالے رنگے ہوئے۔ وہ ہر مقابلے میں حصہ لیتیں، ہر رعایت سے فائدہ اٹھاتیں، اور دو بار ایک ٹی شرٹ

اور ایک تھرمس فلاسک جیت چکی تھیں — جو بے بی کوچمّا نے اپنی الماری میں بند کر رکھا تھا۔

بے بی کوچمّا کو ایمنم ہاؤس سے محبت تھی، اور وہ اُس فرنیچر کو بہت عزیز رکھتی تھی جو وہ سب سے آخر میں زندہ بچ جانے کے سبب ورثے میں حاصل کر چکی تھی — ماماچی کا وائلن اور اس کا اسٹینڈ، اوٹی کے بنے الماریاں، پلاسٹک کی باسکٹ نما کرسیاں، دہلی کے بستر، ویانا سے آیا ہوا ڈریسنگ ٹیبل جس کے ہاتھی دانت کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے، اور وہ گلابی لکڑی کی کھانے کی میز جو ویلوُتھا نے بنائی تھی۔

جب وہ ٹی وی پر چینل بدلتی، تو بی بی سی کے قحط اور جنگوں سے وہ ڈر جاتی۔ انقلاب اور مارکسسٹ-لیننسٹ خطرے کے پرانے خوف ایک بار پھر تازہ ہو گئے تھے — ان نئے خطرات کے ساتھ جو دنیا بھر میں بے گھر، بے کس اور پریشان حال لوگوں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے جڑے تھے۔ وہ نسلی تطہیر، قحط اور نسل کشی کو اپنے فرنیچر کے لیے براہِ راست خطرہ سمجھتی تھی۔

وہ اپنے دروازے اور کھڑکیاں مقفل رکھتی تھی، سوائے اس وقت کے جب وہ انہیں خود استعمال کرتی۔ وہ کھڑکیاں خاص مقاصد کے

لیے کھولتی تھی: تازہ ہوا لینے کے لیے، دودھ کی قیمت ادا کرنے کے لیے، یا کسی پھنسے ہوئے بھنورے کو باہر نکالنے کے لیے (جسے کوچو ماریا تولیے سے گھر میں دوڑتی پھر کر نکالتی)۔

حتیٰ کہ اُس نے اپنا افسردہ، رنگ اُکھڑا ہوا فرج بھی تالے میں بند کر رکھا تھا—جس میں وہ کریم بنز کا ہفتہ وار ذخیرہ رکھتی تھی، جو کوچو ماریا کوٹائم کے بیسٹ بیکری سے لا کر دیتی تھی۔ اسی میں وہ دو بوتلیں بھی تھیں جن میں چاول کا پانی بھرا ہوتا، جو وہ عام پانی کے بجائے پیتی تھی۔ بیفل ٹرے کے نیچے والی شیلف میں وہ ماماچی کے ولو-پیٹرن ڈنر سیٹ کا بچا کھچا حصہ رکھتی تھی۔

راحیل جو انسولین کی درجن بھر بوتلیں لائی تھی، اُنہیں اُس نے پنیر اور مکھن والے خانے میں رکھ دیا۔ اُسے شک تھا کہ اب تو معصوم، گول آنکھوں والے بھی برتن چور، کریم بن لالچی، یا ایمنم میں درآمدی انسولین کی تلاش میں گھومتے ذیابیطسی چور ہو سکتے ہیں۔

وہ جڑواں بچوں پر بھی اعتبار نہ کرتی تھی۔ وہ انہیں ہر چیز کے قابل سمجھتی تھی۔ ہر چیز کے۔ وہ سوچتی، شاید وہ اپنا دیا ہوا تحفہ واپس چرا لیں—اور اسی لمحے اُسے ایک درد کے ساتھ احساس ہوتا کہ وہ

کس جلدی سے اُنھیں پھر ایک وحدت، ایک اکائی کی شکل میں دیکھنے لگی ہے—اتنے برسوں کے بعد۔

ماضی کو اپنے قریب آنے سے روکنے کے لیے، اُس نے فوراً اپنی سوچ بدل دی: وہ۔ وہ اُس کا تحفہ چرا سکتی ہے۔

اُس نے راہیل کو کھانے کی میز کے پاس کھڑا دیکھا—وہی پراسرار خاموشی، وہی نہایت خاموش اور ساکت رہنے کی صلاحیت جو استھا میں آچکی تھی—اور بے بی کوچمّا تھوڑا مرعوب ہوئی راہیل کی خاموشی سے۔

"تو!" اُس نے کہا، آواز میں چیخ، اور لڑ کھڑاہٹ۔ "کیا ارادے ہیں؟ کب تک رکو گی؟ فیصلہ کر لیا ہے؟"

راہیل نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ آواز زنگ آلود سی نکلی۔ جیسے کسی پرانی چادر کا ٹکڑا۔ وہ کھڑکی تک گئی اور کھول دی۔ تازہ ہوا کے لیے۔

"جب کام ہو جائے تو بند کر دینا"—بے بی کوچمّا نے کہا، اور اپنا چہرہ یوں بند کیا جیسے کوئی الماری کا دروازہ بند کرتا ہے۔

اب کھڑکی سے دریا نظر نہیں آتا تھا۔

پہلے آتا تھا—جب تک ماماچی نے پچھلا بر آمدہ ایمنم کا پہلا سلائیڈنگ-فولڈنگ دروازہ لگا کر بند نہ کروادیا تھا۔ ریورینڈ ای۔جان آئیپ اور ایلیوٹی اماچی کی تیل سے بنی پورٹریٹ تصویریں وہاں سے اتار کر اگلے بر آمدے میں لگادی گئی تھیں۔ اب وہ دونوں وہیں ٹنگی ہوئی تھیں—ننھے بابرکت اور اُس کی بیوی—اسٹف شدہ، لگے ہوئے بھینسے کے سر کے دونوں جانب۔

ریورینڈ آئیپ اپنی پُر اعتماد اجدادی مسکراہٹ کے ساتھ اب دریا کے بجائے سڑک کی طرف دیکھتے تھے۔ ایلیوٹی اماچی کچھ زیادہ ہچکچاہٹ لیے لگتی تھیں۔ جیسے وہ پلٹنا چاہتی ہوں مگر پلٹ نہ سکتی ہوں۔ شاید اُن کے لیے دریا کو چھوڑنا اتنا آسان نہ تھا۔ آنکھوں سے وہ اپنے شوہر کی سمت دیکھتی تھیں، مگر دل سے وہ کہیں اور دیکھتی تھیں۔ اُن کی بھاری، مدھم سونے کی کنّکو بالیاں (ننھے بابرکت کی نیکی کی نشانیاں) اُن کے کان کھینچ کر کندھوں تک لٹکادیتی تھیں۔ اُن کے کانوں کے سوراخوں سے گرم دریا، اُس میں جھکتے سیاہ درخت، کشتیوں میں مچھیرے، اور مچھلیاں نظر آتی تھیں۔

اگرچہ اب گھر سے دریا نظر نہیں آتا تھا، مگر جیسے ہر سیپ میں سمندر کی سنسناہٹ رہتی ہے، ویسے ہی ایمنم ہاؤس میں بھی

اب تک دریا کی موجودگی تھی—ایک بہتا، بل کھاتا، مچھلیوں سے بھرا احساس۔

کھڑکی سے کھڑے ہو کر، بالوں میں ہوا لیے، راہیل دیکھ سکتی تھی کہ بارش، ان کے نانی کے اچار کی فیکٹری **"پیراڈائز پِکلز اینڈ پریزرو "** کی زنگ زدہ ٹن کی چھت پر کتنی زور سے برس رہی تھی۔ وہ فیکٹری، جو گھر اور دریا کے درمیان تھی۔

وہ لوگ اچار، اسکواش، جام، کری پاؤڈر اور ٹن میں بند انناس تیار کرتے تھے۔ اور (غیر قانونی طور پر) کیلا جام بھی بناتے تھے، حالانکہ ایف پی او یعنی فوڈ پراڈکٹس آرگنائزیشن نے اسے بین کر دیا تھا—کیونکہ اُن کے معیار کے مطابق، وہ نہ تو جام تھا، نہ جیلی۔ جیلی کے لیے بہت پتلا، جام کے لیے بہت گاڑھا۔ ایک مبہم، غیر درجہ بند نوعیت، اُن کی کتابوں کے مطابق۔

اب جب وہ پیچھے دیکھتی، تو راہیل کو لگتا کہ ان کے خاندان کو درجہ بندی کے ساتھ جو مسئلہ تھا، وہ صرف جام اور جیلی کی بات سے کہیں آگے کا تھا۔

شاید امّو، استھا اور وہ خود اس جرم میں سب سے آگے تھے۔ مگر صرف وہی نہیں۔ دوسرے بھی تھے۔ سب نے قواعد توڑے۔ سب نے ممنوعہ حدود پار کیں۔ سب نے ان قوانین سے چھیڑ چھاڑ کی جو طے کرتے ہیں کہ کس کو محبت کی جائے، کیسے، اور کتنی۔ وہ قوانین جو نانی کو نانی، ماموں کو ماموں، ماں کو ماں، کزن کو کزن، جام کو جام، اور جیلی کو جیلی بناتے ہیں۔

یہ وہ وقت تھا جب ماموں باپ بنے، مائیں محبوبائیں، اور کزن مر گئے—اور اُن کے جنازے بھی ہوئے۔ یہ وہ وقت تھا جب ناقابلِ تصور ممکن ہو گیا—اور ناممکن حقیقت بن گیا۔

یہاں تک کہ صوفی مول کے جنازے سے پہلے ہی پولیس نے ویلوُتھا کو پکڑ لیا تھا۔ اُس کے بازو پر ہتھکڑی کی ٹھنڈک سے رونگٹے کھڑے تھے۔ ٹھنڈی ہتھکڑیوں کی کھٹا دھاتی بُو—جیسے بس کی اسٹیل ریلنگ، یا کنڈکٹر کے ہاتھ کی بُو جو اُسے تھامتے رہتے ہیں۔

جب سب کچھ ختم ہو گیا، تو بے بی کوچمّا نے کہا:

"جیسا بوگے، ویسا کاٹو گے۔"

گویا اُس کا خود سے کچھ لینا دینا ہی نہ ہو۔

وہ اپنی چھوٹی چھوٹی ایڑھیوں پر واپس اپنی کڑھائی کی طرف لوٹ گئی۔
اُس کے چھوٹے پیر فرش کو چھوتے ہی نہیں تھے۔ یہ اُسی کا
خیال تھا کہ استھا کو "واپس بھیجا" جائے۔

مارگریٹ کوچمّا کے دل میں اپنی بیٹی کی موت کا غم اور تلخی ایک زخمی
چشمے کی طرح بل کھاتی تھی۔ وہ کچھ نہ کہتی — مگر جب بھی موقع ملتا،
استھا کو تھپڑ مار دیتی — جب تک وہ انگلینڈ واپس نہ چلی گئی۔

راہیل نے امّو کو استھا کا چھوٹا سا ٹرنک باندھتے دیکھا۔
"شاید وہ ٹھیک کہتے ہیں، "امّو کی سرگوشی میں کہا۔
"شاید لڑکے کو ایک بابا کی ضرورت ہوتی ہے۔"
راہیل نے دیکھا کہ اُن کی آنکھیں سُرخ مردہ سی ہو گئی تھیں۔

انہوں نے حیدرآباد میں جڑواں بچوں کی ایک ماہر سے رابطہ کیا۔
اُس نے خط میں لکھا کہ یکسان نطفہ جڑواں
(monozygotic) بچوں کو الگ کرنا مناسب نہیں، لیکن دو
نطفوں سے پیدا ہونے والے جڑواں (dizygotic) عام بہن
بھائیوں کی طرح ہوتے ہیں، اور اگرچہ وہ ٹوٹے ہوئے گھروں کے بچوں
کی طرح قدرتی اضطراب کا شکار ضرور ہوں گے، مگر وہ

اضطراب بس اتنا ہی ہو گا—کچھ خاص نہیں۔

کچھ غیر معمولی نہیں۔

چنانچہ، استھا کو "واپس بھیج" دیا گیا۔ ایک ریل گاڑی میں—
اُس کے ٹین کے بنے ہوئے ٹرنک اور خاکی ہولڈال میں لپٹے بیج
رنگ کے نوک دار جوتوں کے ساتھ۔
فرسٹ کلاس۔ مدراس میل پر ایک رات کا سفر—
مدراس، اور پھر وہاں سے اُن کے باپ کے ایک دوست کے ہمراہ
کلکتہ۔

اُس کے پاس ایک ٹفن کیریئر تھا، جس میں ٹماٹر کے
سینڈوچ تھے۔
ایک "ایگل فلاسک" بھی تھا، جس پر عقاب کی تصویر بنی تھی۔
لیکن اُس کے ذہن میں کچھ ہولناک تصویریں تھیں۔
بارش۔
دوڑتا، سیاہی جیسا پانی۔
اور ایک بو۔

باسی مٹھاس جیسی—جیسے پرانے گلابوں کی باس جو ہوا میں تیرتی ہو۔

مگر سب سے بدتر یہ تھا کہ اُس کے اندر ایک یاد محفوظ تھی—
ایک نوجوان کے چہرے کی، جس کے منہ پر بوڑھاپن تھا۔
ایک سوجے ہوئے چہرے کی،
ایک الٹی، کچلی ہوئی مسکراہٹ کی۔
ایک شفاف مائع کے پھیلتے تالاب کی، جس میں ایک ننگی بلب کی جھلک پڑ رہی تھی۔
ایک خون آلود آنکھ کی—جو پہلے کھلی، بھٹکی، اور پھر ٹھہر کر استھا کو گھورنے لگی۔

اور استھا نے کیا کیا تھا؟
اُس نے اُس پیارے چہرے کی طرف دیکھا—
اور کہا:
ہاں۔ہاں، وہی تھا۔

یہ وہ لفظ تھا" — **ہاں** — "جسے استھا کے اندر چھپے ہوئے آکٹوپس کی گرفت بھی نہ پہنچ سکی۔

کوئی ذہنی صفائی، کوئی کوشش فائدہ نہ دے سکی۔

وہ لفظ جیسے اُس کے ذہن کی کسی گہری جھری میں،

کسی فولڈ یا درز میں پھنسا ہوا تھا—

جیسے آم کے بال دانتوں میں الجھ جائیں—

نہ نکلے، نہ نکلے جا سکیں۔

اگر حقیقتاً دیکھا جائے تو شاید یہ کہنا درست ہو کہ

یہ سب کچھ اُس دن سے شروع ہوا تھا، جب صوفی مول ایمنم آئی۔

شاید یہ سچ ہو کہ کبھی کبھی ایک دن—چند درجن گھنٹے—پوری زندگیوں کی سمت بدل دیتے ہیں۔

اور جب وہ ایسا کرتے ہیں،

تو وہ چند درجن گھنٹے—

کسی جھلسے ہوئے گھر کی بچی کھچی اشیاء کی طرح—

جلے ہوئے گھنٹے، سیاہ پڑی تصاویر، جھلسا ہوا فرنیچر—

انھیں دوبارہ ملبے سے نکالنا پڑتا ہے،

پرکھنا پڑتا ہے،

محفوظ رکھنا پڑتا ہے،

شمار کرنا پڑتا ہے۔

چھوٹے چھوٹے واقعات، معمولی سی باتیں—

جو توڑ دی گئی تھیں—

اب نئے مفہوم سے بھری جارہی ہیں۔

از سرِ نو جوڑی جارہی ہیں۔

اور ایک دم،

وہ سب

کہانی کی دھوپ میں سفید ہوئی ہڈیاں بن جاتی ہیں۔

پھر بھی، یہ کہنا کہ یہ سب کچھ اُس وقت شروع ہوا جب
صوفی مول ایمنم آئی—صرف ایک زاویۂ نظر ہے۔ اُتنی ہی
صداقت سے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اصل میں یہ آغاز
ہزاروں سال پہلے ہوچکا تھا۔ اس سے بہت پہلے کہ مارکس وادی
آئے۔ اس سے پہلے کہ انگریزوں نے ملابار پر قبضہ کیا۔ اُس سے بھی
پہلے جب ڈچ یہاں غالب آئے۔ یا جب واسکوڈی گاما نے اس
خطے میں قدم رکھا۔ اس سے بھی پرانا وقت—جب زامورین نے
کالیکٹ پر قبضہ کیا۔ اُس سے بھی پہلے—جب تین شامی بشپ، جو
جامنی جبے پہنے ہوئے تھے، پرتگالیوں کے ہاتھوں قتل ہوکر سمندر میں
تیرتے ہوئے پائے گئے—اُن کے سینوں پر سانپوں کی کنڈلیاں

لپٹی ہوئی تھیں، اور اُن کی الجھی ہوئی داڑھیوں میں صدف کی گانٹھیں بندھی ہوئی تھیں۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب تب شروع ہوا، جب عیسائیت ایک کشتی میں سوار ہو کر کیرالہ پہنچی — اور یوں جذب ہو گئی، جیسے چائے کی پتی کپ میں گھلتی ہے۔ اصل میں شاید یہ اُس وقت شروع ہوا، جب محبت کے قوانین بنائے گئے تھے۔ وہ قوانین—
جو یہ طے کرتے ہیں کہ کس سے محبت کی جا سکتی ہے، کیسے کی جا سکتی ہے، اور کس حد تک کی جا سکتی ہے۔

اور جتنی۔

تاہم، عملی نقطہ نظر سے—
اس انتہائی بے رحم،
انتہائی "عملی" دنیا میں...

II

چھوٹے خداؤں کا وقت

(Pappachi's Moth)